اشتراکیت اور اسلام

مؤلفہ
مسعود عالم ندوی

مکتبہ چراغ راہ۔ کراچی ۱

جس میں

اسلام اور اشتراکیت کی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ اور اشتراکیت
کے خلاف فطرت معاشی اصولوں کی علمی وفنی تنقید کی گئی ہی۔ اور
اس کے مابعد الطبعی نظریوں پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہی۔
نیز اسلامی نظام کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔

از

مسعود عالم ندوی

مکتبہ "چراغ راہ"، کراچی

نومبر ۱۹۴۹ء

طبع دوم ۲۰۰۰

طابع وناشر:- غلام محمد

مطبع:- ناظر پرنٹنگ پریس، کراچی

قیمت:- دو روپے آٹھ آنے

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ
دو لفظ (دیباچہ طبع اول)	۱
دیباچہ طبع دوم	۳
۱۔ موضوع سخن	۴
۲۔ اشتراکیت اور اس کا پس منظر	۹
(الف) سرمایہ داری	۱۰
(ب) سرمایہ داری کا عروج	۱۲
(ج) سرمایہ داری نظام اور مذہب	۱۵
۳۔ معاشی اشتراکیت اور اس کے علم بردار	۱۶
۴۔ نراج	۱۹
۵۔ اشتمالیت یا مارکسی اشتراکیت	۲۲
(الف) کارل مارکس	۲۴
(ب) کارل مارکس کی تصنیفات	۲۸
(ج) اشتراکیت کا مادی فلسفہ	۳۱
۶۔ طبقاتی تصادم	۳۵
۷۔ تاریخ کی مادی تعبیر اور لادینیت	۴۰
تنقید اور جائزہ	۴۶
۸۔ مارکسی اشتراکیت کی تاریخ	۵۲
(الف) روسی انقلاب سے پہلے	۵۲
(ب) روسی انقلاب اور اس کے بعد	۵۶
(ج) جنگ کے بعد (سنہ ۴۵ء، سنہ ۴۹ء)	۶۱
۹۔ مذہب اور اشتراکیت	۶۳
۱۰۔ اسلام اور اشتمالیت	۷۲
۱۱۔ اشتراکیت اور اخلاق	۹۶
۱۲۔ اشتراکیت کا معاشی پہلو	۱۰۴
(i) دولت کی مساویانہ تقسیم	۱۰۸
(ii) شخصی ملکیت کی منسوخی	۱۱۴
۱۳۔ اشتراکیت کا اپنے اصولوں سے انحراف	۱۱۵
(الف) مارکسی لینینی نظریہ	۱۱۸
(ب) عالمگیر انقلاب	۱۲۰
(ج) قومیت اور نسل پرستی	۱۲۳
(د) امپریلزم	۱۲۵
(ہ) استبداد	۱۳۰

مضمون	صفحہ
(و) اجتماعی ضابطہ بندی	۱۳۵
(۸) معاشی اصولوں میں ترمیمیں	۱۳۸
(۱) شخصی ملکیت	۱۳۹
(۲) ترکہ	۱۴۰
(۳) سود	۱۴۰
(۴) بیمہ	۱۴۱
(۵) زرعی ملکیت	۱۴۱
(۶) اجرت کا فرق	۱۴۲
(۷) اصول مساوات کا فقدان	۱۴۴
(۸) مذہبی آزادی	۱۴۵
(۹) ایک نیا مذہب	۱۴۸
۱۴- اسلام کا معاشی نظام	۱۵۰
۱- اعتدال کی راہ	۱۵۰
۲- کسب معاش کی آزادی اور اس کے حدود	۱۵۳
۳- اخلاقی ضابطے	۱۵۷
(الف) حلال و حرام	۱۵۷
(ب) صرف پر پابندی	۱۵۸
(ج) انفاق پرزور	۱۵۹
(د) لین دین میں خوش معاملگی	۱۶۰
(ہ) قرض	۱۶۲
۴- قانونی ضابطے	۱۶۴
(الف) سلبی قانونی ضابطے	۱۶۴
۱- سود	۱۶۴
۲- مستقبل کے سودے	۱۷۳
۳- احتکار	۱۷۴
۴- اکتناز	۱۷۵
(ب) ایجابی قانونی ضابطے	۱۷۶
۱- زکوٰۃ	۱۷۶
۲- بیت المال	۱۷۸
۳- تقسیم غنیمت	۱۸۱
۴- قانون وراثت	۱۸۲
ایک اہم نکتہ	۱۸۳
خلاصہ بحث	۱۸۴
۱۵- کتابیات	۱۸۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

دو لفظ

(دیباچہ طبع اول)

زیر نظر رسالہ ایک دفعہ نہیں لکھا گیا۔ اس کے مختلف ٹکڑے مختلف وقتوں میں لکھے گئے ہیں۔ سب سے پہلے کوئی چار برس ہوئے محبِ محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی (مدیر الفرقان) کی فرمائش پر ایک مضمون اخبار زمزم کے لیے لکھا گیا۔ ان دنوں ایک احراری لیڈر (جو اب مرحوم ہو چکے ہیں، اللہ ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے) زمزم کے صفحات پر اسلام اور اشتراکیت کو ایک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مولانا نعمانی کا بیان ہے کہ راقم کے مضمون سے بہتوں کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں۔ پھر انھی کی فرمائش پر اسی مضمون کو پھیلا کر اور علمی سنجیدگی کے ساتھ الفرقان کے لئے دوبارہ مُرتّب کیا۔ الفرقان میں شائع ہوتے ہی متعدد اصحاب نظر نے تحسین کے خطوط لکھے۔ مخدومی مولانا عبد الماجد دریابادی (مدیر صدق) نے خاص طور پر حوصلہ افزائی کی۔

بزرگوں اور دوستوں کی حوصلہ افزائیوں نے مزید مطالعہ کی طرف رغبت دلائی۔ مطالعہ جاری تھا، اور ابھی اس مضمون کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا خیال بھی نہیں پیدا ہوا تھا، کہ "دو تحریکیں" ایسی ہوئیں جن سے اس مقالہ کو از سرِ نو کتابی صورت میں مرتب کرنے پر مجبور ہو گیا۔ کوئی دو برس ہوتے ہیں کہ ایک دوست نے حیدر آباد کے ایک مشہور دار الاشاعت کا شائع کردہ (اسلام اور اشتراکیت نامی)

پمفلٹ دکھایا۔ ٹائیٹل پر اس گنہ گار کا نام تھا۔ اور دیباچہ میرے کرم فرما اور ہم سبق عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی مخدوم پوری گیاوی کا لکھا ہوا۔ مضامین پر نظر ڈالی تو وہی زمزم والا ادھورا مضمون، اور وہ بھی غلط سا چھپا ہوا، سر پکڑ کر رہ گیا۔ ظالموں نے چھپنے کے بعد ایک نسخہ بھی بھیجنے کی دردسری نہیں مول لی۔ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں تھا، لاہور کے ایک دار الاشاعت نے بھی میرے رسالہ "عربوں کی قومی تحریک" کے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا تھا، ہم لوگ قانونِ وقت کی امداد لینے سے رہے، صبر کے سوا چارہ نہیں تھا۔

دوسری تحریک استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہٗ کی طرف سے ہوئی، اور معارف کے لیے ایک مبسوط مضمون لکھنے کا حکم ہوا، شفیق استاذ اور مربی کا حکم کس طرح اٹھایا جا سکتا تھا، اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے اعتراف و احساس کے باوجود الفرقان والے مضمون پر نظر ثانی شروع کی۔ کچھ نیا مواد ملا، اور نئے مسئلے بھی سامنے آئے۔ آخر توفیقِ ایزدی سے ایک خاصہ رسالہ مرتب ہو گیا۔

اگر اس میں خامیاں ہیں تو یہ خاکسار کی کم علمی اور بے بضاعتی کا نتیجہ ہے، اور اگر دوستوں کو کچھ کام کی باتیں مل جائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھا جائے اور اس کے بعد استاذ ممدوح کی تربیت و تعلیم کا فیض۔ اہلِ علم سے گذارش ہے کہ وہ کوتاہیوں اور لغزشوں پر بے تکلف متنبہ فرمائیں۔

یہ اس لیے عرض کیا جا رہا ہے کہ مطالعہ جاری ہے، اور انشاء اللہ دوسرے ایڈیشن کے وقت مزید اضافوں کا ارادہ ہے۔ اہلِ نظر کے مشورے خاص طور پر شکریہ کے ساتھ قبول کیے جائیں گے۔ اشتراکی حضرات بھی کہیں کوئی علمی غلطی دیکھیں تو ضرور متنبہ کر دیں۔ آخر میں مخدوم و محترم مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی (امیر جماعت اسلامی) کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، کہ انھوں نے مسودہ پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کی، اور اپنے صائب مشوروں سے مؤلف کو ممنون کیا۔ بارگاہ رب العزت میں التجا ہے کہ وہ اس ناچیز کوشش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے۔ وبرحمۃ اللہ عبدًا قال آمینا۔

(دیباچہ طبع دوم)

یہ کتاب آج سے چار سال پہلے شائع ہوئی تھی، اور چھ سات ماہ کے عرصے میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ ملیالم میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہو کر مقبول ہوا۔ گجراتی ترجمہ کی بھی ایک صاحبِ ذوق نے اجازت لی۔ اہلِ علم نے حوصلہ افزا رائیں دیں۔ اشتراکیوں نے بھی جہاں تک ان کے افکار و نظریات کے پیش کرنے کا تعلق ہے، کسی تحریف یا غلطی کی نشاں دہی نہیں کی۔ البتہ اسلامی پہلو کی تشنگی کا احساس رہا، اور بعض اہلِ نظر نے اس طرف توجہ بھی دلائی۔ خیال تھا کہ دوسرے ایڈیشن میں اسلامی نظام کی توضیح و تشریح کے ساتھ ساتھ اشتراکیت اور اس کے نظریوں، نیز متضاد افکار و اعمال پر خاص طور پر تنقید کی جائے۔ اس غرض سے مطالعہ کر رہا تھا اور یادداشتیں (Notes) مرتب کرتا جاتا تھا کہ مشرقی پنجاب کا جاں کاہ حادثہ پیش آیا (اگست ۴۷ء) اور راقم کو "خالی ہاتھ" لاہور کا رُخ کرنا پڑا۔ ہر چند کہ مسودات اور علمی یادداشتوں کے محفوظ رکھنے کی کوشش کی، پھر بھی اُدھیڑ بُن اور عجلت میں بعض چیزیں ضائع ہو گئیں۔ ان ہی میں اشتراکیت سے متعلق یادداشتیں اور تراشے بھی تھے۔ کتابوں کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

—— ان حالات میں از سرِ نو مطالعہ اور چھان بین کی ضرورت تھی۔ اپنی سی کوشش تو کی، مگر کاموں کی زیادتی اور صحت کی خرابی کے باعث تلاش اور جستجو کا حق ادا نہ کر سکا۔ جو کچھ ہو سکا حاضر ہے۔ اگر زندگی باقی رہی اور اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہا، تو آئندہ اشاعت میں تشنہ بحثوں کی مزید تفصیل کر دی جائے گی۔

عاجز
مسعود عالم ندوی

دار العروبہ۔ راولپنڈی
۲۷ ربیع الاول ۶۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

(۱)

موضوعِ سخن

ادھر چند سالوں سے اردو اخباروں اور رسالوں میں "اسلام اور اشتراکیت" پر آئے دن رائے زنی ہوتی رہتی ہے۔ اور ان کے باہمی موازنہ اور تقابل پر مختلف قسم کی تحریریں نکلتی رہتی ہیں۔ مگر ان تمام تحریروں کے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اسلامی ہند میں اشتراکیت کا نظری پہلو عام طور پر نہیں سمجھا گیا ہے، اور اس کا مابعد الطبیعی فلسفہ عام نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس سلسلہ کی اکثر بحثیں اصل موضوع سے ہٹ جاتی ہیں،......

بحث یہ نہیں کہ اسلام کی تعلیم میں مساوات و آزادی کا سبق کس حد تک شامل ہے؟ اور نہ یہ گفتگو ہے، کہ اسلام دولت مندی اور مالداری کو کہاں تک برداشت کر سکتا ہے؟ جو لوگ صرف اس حد تک اسلام اور اشتراکیت کا موازنہ کر کے خاموش ہو جاتے ہیں، وہ حقیقت میں اشتراکیت کے مابعد الطبیعی فلسفہ اور اس کے نظامِ معیشت سے دانستہ یا نادانستہ چشم پوشی کرتے ہیں۔ اصل میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ "اسلام اور اشتراکیت" انسانی مشکلوں کے حل کرنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں یا نہیں؟ ان دونوں کے ماننے والے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر انسانی فلاح و بہبود کی کوئی مشترک راہ نکال سکتے ہیں یا

نہیں ؛ جن لوگوں نے اشتراکیت کے فلسفہ اور نظام کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہے، وہ
اس بات کی شہادت دیں گے، کہ یہ ناممکن ہے، ان دونوں کے درمیان مشرق و مغرب
کا فرق ہے۔ ایک کی راہ اگر کعبے کو جاتی ہے تو دوسرے کی ماسکو کو۔

عام طور پر لوگ اشتراکیت بول کر مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کی علم برداری،
سرمایہ داری کی بیخ کنی، اور دولت کی مساویانہ تقسیم سے زیادہ کچھ نہیں مراد لیتے۔
حالانکہ اشتراکیت صرف ان چیزوں کا نام نہیں۔ یہ تو اوپری چیزیں ہیں۔ اشتراکیت صرف
چند معاشی اور سیاسی مسئلوں کا نام نہیں۔ اشتراکیت ایک مستقل اور مرتب فلسفۂ حیات ہے۔
کائنات اور اس کے نظام سے متعلق اس کا خاص فلسفہ اور مخصوص تصوّر ہے۔ جس طرح
اسلام صرف چند ظاہری رسموں اور اٹھنے بیٹھنے کے مخصوص طریقوں کا نام نہیں، بلکہ
عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم اخلاق و معاملات کو بھی شامل ہے۔
اس کا اپنا انچھوتا نظامِ مملکت ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری کی افراط و تفریط سے
الگ یہ اپنا عادلانہ نظامِ معیشت بھی رکھتا ہے۔ یہ ایک مستقل تہذیب اور زندگی
کا ایک جامع دستور العمل ہے۔ جس کے دائرے سے نظامِ کائنات، سیاسیات
اور معاشیات کا کوئی گوشہ باہر نہیں۔ تو جس طرح اسلام صرف چند ظاہری رسموں
کا نام نہیں، بالکل اسی طرح اشتمالیت[1] (Communism) اب ابتدائی انیسویں

---

[1] اشتراکیت (Socialism) اور اشتمالیت (Communism) ایک ہی فکر
کے دو زینے یا درجے (Stages) ہیں۔ ہم نے ان دونوں اصطلاحوں کو ایک دوسرے
کی جگہ بھی استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ ہمیں زیادہ بحث اصل فکر سے ہے۔
بہر حال ان دونوں مرحلوں کے باہمی فرق کے متعلق لینن کے یہ ارشادات مزید معلومات کا باعث ہوں گے۔

صدی عیسوی کی خیالی اشتراکیت (Utopian Socialism) نہیں رہی
جس کا دائرۂ نفوذ صرف معاشی زندگی تک محدود ہو، بلکہ یہ ایک مرتّب اور مربوط نظامِ زندگی
ہے - اب یہ صرف غریبوں اور مفلسوں کی اقتصادی مشکلوں کا حل ہی نہیں، بلکہ اس
کے ساتھ اخلاق، تمدّن و تہذیب اور مابعد الطبیعی تخیلات کا ایک مستقل نظام بھی ہے -
اور جو بھی اشتراکیت کا نام لے گا، وہ اس پورے نظام کا داعی اور حامی سمجھا جائے گا -
اب اشتراکیت بول کر وہی نظامِ حیات سمجھا جاتا ہے جسے مارکس اور اینجلز نے مرتّب
کیا، اور لینن نے پہلی مرتبہ اُسے روس میں عملی جامہ پہنایا - یہ نہیں ہو سکتا، کہ آپ کہیں
تو اسلام، اور اشتراکیت دونوں ایک ہیں - اور جب مارکس کے مادّی فلسفہ کا حوالہ
دیا جائے، تو جھٹ بول اٹھیں، کہ "جناب! ہماری مراد یہ نہیں، ہم تو صرف اس کی ظاہری

(بقیہ سابق) "میں اب آخری مسئلہ پر آرہا ہوں، یعنی اپنی پارٹی کے نام سے متعلق عرض کرتا
ہوں - ہمیں اپنے کو اشتمالی پارٹی (Communist Party) کہنا چاہیے، جس طرح
کہ مارکس اور اینجلز اپنے کو اشتمالی کہتے تھے - انسانیت سرمایہ داری سے یک بیک اشتمالی
سوسائٹی میں نہیں پہنچ سکتی - اسے اشتراکی دَور سے گذرنا پڑے گا، جس میں ذرائع پیداوار کی
ملکیت انفرادی ہاتھوں سے نکل جاتی اور پیداوار کی تقسیم افراد کی کارکردگی کے اعتبار سے
ہوتی ہے - ہم اس سے آگے بھی دیکھتے ہیں - دیر یا سویر، اشتراکیت، اشتمالیت کا قالب
ضرور اختیار کرے گی، جس میں پیداوار کی تقسیم کارکردگی اور استعداد کے لحاظ سے نہیں ہوگی -
بلکہ ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق تمام چیزیں مل جایا کریں گی۔" دیکھئے جون اسٹریچی
کی کتاب (The Theory & Practice of Socialism) صفحہ ۹
اس سے یہ معلوم ہوا کہ لینن اشتراکی (Socialist) کی بجائے اشتمالی (Communist

(باقی صفحہ ۷ پر)

معاشی تعلیم لینا چاہتے ہیں"۔ منطق اور عقل سلیم کی رُو سے یہ جواب صحیح نہیں ہو سکتا۔ جب آپ مارکس کے مرتب کردہ مادی فلسفے کے قائل نہیں، تو پھر آپ کو اشتراکیت کی ثنا خوانی سے پہلے صاف صاف کہنا چاہیے کہ مارکس کا مادی فلسفہ سراسر الحاد و دہریت ہے۔ اور ہم صرف اس کے معاشی اصول کے خوشہ چیں ہیں"۔ لیکن یہاں مقصود تو سادہ لوح نوجوانوں کو مبتلائے فریب کرنا ہے۔ اشتراکیت (یا ان ہی کی زبان میں اشتراکی معاشیات) کی تلقین کرنا اور اشتراکی فلسفے کے متعلق ایک حرف نہ کہنا کامیاب پروپیگنڈا تو ہو سکتا ہے، مگر انصاف پسندی اور حق پرستی کی روش نہیں کہی جا سکتی۔

اس مقالے کی ترتیب سے راقم کی اصل غرض اسلام اور اشتراکیت کے اسی فرق کو واضح کرنا ہے تاکہ وہ سادہ دل نوجوان جو اپنی سادگی اور جدت پسندی کے باعث اسلام اور اشتراکیت کو ایک سمجھے ہوئے ہیں، ذرا ایک مرتبہ پھر ٹھنڈے دل سے غور کر لیں۔ ہمیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن جیسے نام رکھنے والے نوجوانوں میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو جان بوجھ کر اشتراکیت کو ایک علیحدہ اور مستقل نظام فکر سمجھتے ہوئے قبول کر رہا ہے۔ سر دست ان سے ہمیں کچھ نہیں کہنا ہے۔

(بقیہ سابق) کہلانا پسند کرتا ہے۔ اس کے بعض تاریخی اسباب ہیں، جیسا کہ اسٹریچی کا خیال ہے۔ اشتراکیت (Socialism) کے نام سے طرح طرح کے معاشی نظریے پیش کئے جا چکے تھے۔ اس لیے لینن، مارکس کی جارحانہ (Aggressive) "اشتراکیت" کو اشتمالیت، کا نام دینا زیادہ پسند کرتا ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے۔ دوسری بڑی وجہ وہ مقصد ہے جو اشتمالیت اپنے سامنے رکھتی ہے، یا کم سے کم رکھنے کا دعویٰ کرتی ہے یعنی ایسی مثالی سوسائٹی کا قیام، جہاں نہ طبقات ہوں، اور نہ کوئی قید و پابندی، جس کی توضیح

(باقی اگلے صفحہ پر)

وہ مارکس اور اس کی کتابوں سے تو واقف ہیں، مگر قرآن مجید اور سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائی ہوئی تعلیم سے بالکل نابلد ہیں۔ ان کے لئے دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔ مگر بہت سے عبداللہ اور عبدالرحمٰن نام رکھنے والے ایسے بھی ہیں (اور آج کی صحبت میں روئے سخن زیادہ تر ان ہی کی طرف ہے) جنھوں نے ظاہر میں یہ دیکھ کر کہ اسلام اور اشتراکیت دونوں سرمایہ داری اور سامراج (امپیریلزم) کے خلاف ہیں، دونوں مساوات کے داعی، رنگ و نسل کے دشمن، اور غریب طبقوں کی بھلائی چاہتے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ دونوں ایک ہیں۔ اور مسلمان بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے، اور اشتراکی بھی۔ اس کا قبلہ مکہ مکرمہ بھی ہو سکتا ہے، اور سیاسی و معاشی دشواریوں کے حل کے لئے وہ ماسکو کا رُخ بھی کر سکتا ہے۔ وہ رسولِ عربی (اللہ کا آپ پر ہزار ہزار بار درود و سلام) کی پیروی بھی کر سکتا ہے، اور مارکس کو بھی اپنا معاشی و سماجی رہنما تسلیم کر سکتا ہے۔ اشتراکیت اور اس کے نظام کی سرسری

(بقیہ سابق) آگے آئے گی۔ خود مارکس بھی اشتمالیت (Communism) ہی کا لفظ پسند کرتا ہے۔ لہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشتراکیت و اشتمالیت کے معاشی اصول و تصورات صحیح ہیں۔ اور عقل سلیم کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں، اور نہ یہ غلط فہمی ہو کہ ہمارے نزدیک کسی درجے میں بھی اشتراکیت کے معاشی اصول اسلامی نظام حیات کے دائرے میں ٹھیک بیٹھ سکتے ہیں۔ ےہ پروپیگنڈا بازوں کے نام لینا نہیں چاہتا۔ ان مثال کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ لاہور کے ایک سہ روزہ صحیفہ کے صفحات پر ایک موم لیڈ عرصہ تک اسی طرح اشتراکیت کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ کلکتہ کے ایک مشہور اخبار نویس کا بھی یہی شیوہ ہے۔ راقم نے ایک موقع پر (دسمبر ۱۹۴۷ء) جب ان کی توجہ اس تضاد کی طرف مبذول کرائی تو انھوں نے نہایت سادگی کے ساتھ فرمایا، ہم نے اس پر کبھی غور نہیں کیا ہمیں اس سے کوئی بحث ہی نہیں، ہمیں تو صرف غریبوں کو دکھ درد کا مداوا کرنا ہے۔ اللہ رے معصومیت یہ سب پروپیگنڈے کے

واقفیت بھی دو اور دو چار کی صورت میں یہ حقیقت نمایاں کرتی ہے کہ اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے کی نقیض (Contrary) اور ضد ہیں، دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ رسولِ کریم (اللہ کی آپ پر رحمت اور سلام) کا ماننے والا مارکس اور اس کی تعلیم پر نفرین بھیجنے پر مجبور ہوگا۔ اور مارکس کا ماننے والا رسولِ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان نہیں لا سکتا۔

یہ چند اشارات تھے۔ اصل موضوع کی طرف آئیے، اب ہم ذرا تفصیل سے بتائیں کہ اشتراکیت کیا ہے؟ اور اس کے مادی فلسفے کی نوعیت کیا ہے؟ کارل مارکس کون تھا؟ اور اس کی تعلیم کیا ہے؟

(۲)

اشتراکیت اور اُس کا پس منظر

اشتراکیت کیا ہے؟ اس کے سمجھنے کے لیے اٹھارھویں اور اُنیسویں صدی کے یورپ کا سمجھنا اور جاننا ضروری ہے۔ اٹھارہویں صدی اور اُنیسویں صدی کا آغاز یورپ میں سرمایہ داری کے عروج کا زمانہ تھا۔ جب صنعتی انقلاب کی وجہ سے فراہمی دولت کے ذرائع چند انسانوں کے پاس سمٹ کر جمع ہو گئے تھے، اور عام آبادی سرمایہ داروں کی اُجرتی غلام ہو کر رہ گئی تھی۔ معیشت میں انفرادیت (Individualism) کی تعلیم کا یہ لازمی نتیجہ تھا۔ سرمایہ دار اور عیسائی کلیسا عوام کو لوٹنے میں ایک دوسرے کے حلیف بنے ہوئے تھے۔ قانون اور مذہب سب کے سب سرمایہ داروں کے آلۂ کار بن کر رہ گئے تھے۔ اس سرمایہ دارانہ نظام کے ردِ فعل نے اشتراکیت (Socialism) کی صورت اختیار کر لی۔

(الف) سرمایہ داری آپ نے کبھی غور کیا کہ "سرمایہ داری" ہے کیا چیز؟ سرمایہ اور راس المال، تو اپنی جگہ پر کوئی بُری چیز نہیں۔ اگر ایک خاندان کسی صنعت سے اپنا پیٹ پالتا ہے، اور اس کے تمام افراد اسی صنعت (Industry) میں محنت کرتے ہیں، تو اس میں کوئی قباحت نہیں، حالانکہ اس صورت میں دولت آفرینی موجود ہے۔ لیکن اگر اسی خاندان کے کام کو فروغ حاصل ہو، اور اپنے کنبے کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بھی معمولی مزدوری پر کام لینا شروع کر دے۔ اور اپنی ضروریات سے زیادہ چیزیں پیدا کر کے دوسری منڈیوں میں منفعت بخش تجارت شروع کر دے، تو یہ کاروبار، سرمایہ داری کی فہرست میں داخل ہو جائے گا۔ یہی کاروبار آگے بڑھ کر ایک منظم سرمایہ دارانہ آڑھت اور کارخانہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ جہاں مزدوروں کو نہایت معمولی اُجرت ملتی ہے۔ اور سارا نفع سرمایہ دار کی جیب میں جاتا ہے۔

اس بیان سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ "سرمایہ" سے مراد وہ دولت ہے، جو مزید دولت پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جائے۔ اور سرمایہ داری سے مُراد وہ نظام (System) ہے جو اس دولت آفرینی کے عمل کی نگرانی اور رہنمائی کرتا ہے۔

سادہ "سرمایہ داری" یعنی "دولت" کے ذریعہ دولت پیدا کرنے کا سلسلہ ہر دَور میں کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے۔ اور اسے ہم آزاد تجارت بھی کہہ سکتے ہیں، مگر یورپ کی نئی سرمایہ داری اتنی سادہ چیز نہیں۔ یہ ایک نظامِ حیات ہے، جو کرۂ ارضی کے تمام وسائل و ذرائع کو چند انسانوں، یا انسانوں کے چند مجموعوں کے حوالہ

کر دینا چاہتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اس نظام کی فطرت یہ ہے کہ پوری سوسائٹی اور اس کے
تمدن کو اپنے رنگ میں رنگ دے۔ جب افراد کو کھانے، کمانے، روپیہ پیدا کرنے، پیدا
کرانے، اور اسی دُھن میں دن رات سرگرداں رہنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا، تو اس کا
لازمی نتیجہ عیش و عشرت، اخلاقی انحطاط، خود غرضی، اور شقاوتِ طبع کی صورت میں
رُونما ہوگا۔ اصل میں نظامِ سرمایہ داری کا آغاز ہی خود غرضی سے ہوتا ہے۔ اور جس
سوسائٹی میں خود غرضی جڑ پکڑ گئی، وہاں اُن اخلاقی صفات کا نشو و نما پانا بہت مشکل
ہے جن کا وجود انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری ہے۔ اخلاقی نقطۂ نگاہ سے
الگ خالص معاشی نقطۂ نظر سے بھی اس خود غرضی اور دولت کے سمٹاؤ کا نتیجہ خوش گوار
نہیں ہو سکتا۔ لازمی طور پر سوسائٹی دو طبقوں میں بٹ جائے گی۔ مال دار اور
غیر مالدار کی کش مکش آخر فتنہ و فساد کا دروازہ کھول دے گی۔ اس سرمایہ دارانہ نظام
کی تباہ کاریاں سب کے سامنے ہیں، اور اس کا ردِّ فعل بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل
نہیں۔ اس لئے اس کی بُرائیوں کی زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

اس نظام میں ایک چیز خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ جس طرح سرمایہ دار اپنے
کارخانوں کی پیداوار منڈیوں میں بھیجتا ہے، اسی طرح مزدور اپنی محنت کارخانہ دار کے
ہاتھ بیچتا ہے۔ لیکن دونوں کے بیچنے میں فرق ہے۔ قیمتوں کا اتار چڑھاؤ، محنت،
(Lahour) اور پیداوار (Production) دونوں کے ساتھ ہے۔
سرمادار اپنی پیداوار کو روک کر قیمت کے اتار چڑھاؤ کا انتظار کر سکتا ہے، لیکن غریب
فاقہ کش مزدور، جس کی زندگی کا دار و مدار روزمرّہ کی اجرت پر ہے، ایک روز بھی اتار
چڑھاؤ کے بھروسہ پر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس لئے وہ کم سے کم اُجرت پر سرمایہ دار

کے ہاتھ اپنی محنت فروخت کرنے پر مجبور ہے، اور اس طرح رفتہ رفتہ سرمایہ دار کے پاس دولت سمٹ کر جمع ہو جاتی ہے۔ اور بے کس اور بے خانماں مزدوروں کا گروہ بڑھتا جاتا ہے۔

(ب) سرمایہ داری کا عروج سرمایہ داری کا اصلی عروج یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہوا، جب کہ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور اُنیسویں صدی کے آغاز میں بجلی[1] اور مشین کی کارفرمائیوں سے پیداوار کا عمل روز افزوں تیز ہونے لگا۔ اور اس کے لازمی نتیجے کے طور پر دولت کم سے کم افراد کے پاس سمٹ کر جمع ہونے لگی۔ اور بے خانماں مزدوروں کا طبقہ دن پر دن بڑھنے لگا۔ صنعتی انقلاب Industrial Revolution سے پہلے صنعت و حرفت کی گرم بازاری کے باوجود پیداوار کی یہ ترقی نہ ہو سکی تھی، اس کی اصل وجہ عقل انسانی کی حیرت انگیز اکتشافات اور سائنس کی ترقیاں تھیں۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ یورپ کی موجودہ سرمایہ داری، صنعتی انقلاب اور اس کے نتیجے میں عظیم الشان پیمانے پر پیداوار اور تجارت کی روز افزوں ترقی سے ظہور میں آئی۔ یورپ کے ملکوں میں انگلستان اس باب میں سبقت لے گیا، اور صنعتی ترقیاں پہلے وہیں نمودار ہوئیں۔ آزاد سیاسی اداروں، آزاد داخلی تجارت، آب و ہوا اور جغرافی پوزیشن کی آسانیوں، بیرونی تجارت کے تجربے، اور نئی دنیا سے خاص تعلقات کو اس کی سبقت اور ترقی کے اسباب میں شمار کیا جا سکتا ہے[1]
امریکہ گو اس میدان میں پیچھے آیا، مگر وہ اب تمام حریفوں کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ اس وقت سرمایہ داری نظام کی نمائندگی اور قیادت امریکہ ہی کر رہا ہے۔

---

[1] برٹانیکا: مقالہ (Industrial Revolution)،

اور اس وقت دنیا کا سب سے بڑا اساہو کار رہی ہے۔ آئیے اب ہم ذرا ان دونوں سرمایہ دار ملکوں (انگلستان اور امریکہ) کے نظام پر ایک نظر ڈال لیں۔ تاکہ اس کے ردِ فعل اور حریف اشتراکیت کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

آپ یورپ اور امریکہ کے موجودہ سرمایہ داری نظام کو یوں سمجھ سکتے ہیں، کہ یہ ایک ایسا نظامِ معیشت ہے، جس میں زمینیں، کارخانے، اور کانیں، افراد یا افراد کے ایک مجموعہ کی ملکیت ہوتی ہیں۔ پیداوار کے یہ ذرائع ان لوگوں کے ہاتھوں کام کرتے ہیں، جن کا ان کی ملکیت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور یہ غریب اُن لوگوں کی نفع اندوزی کے لئے محنت کرتے ہیں جو ان ذرائع کے مالک ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں ہر کام کا محور نفع اندوزی ہے، محبت یا ہمدردی نہیں۔ صرف نفع حاصل کرنے کی توقع ہی ایک چیز ہے، جو ذرائع پیداوار کے مالکوں کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اُن ذرائع و آلات کے استعمال کی اجازت دیں، اور استعمال کرائیں۔ اور پھر یہ نفع اندوزی صرف محرک نہیں، سرمایہ دارانہ پیداوار کی کارفرما قوت (Regulator) بھی ہے جو کبھی سرمایہ دار کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا، سرمایہ داری نظام میں یہ صرف مقصد نہیں، پیداوار کی خاص حالت کا یہ داخلی تقاضا ہے کہ نفع حاصل ہو۔ جب موجودہ سرمایہ داری کا مزاج یہ ہے، تو طبعی طور پر محنت کی ارزانی اور سرمایہ داری کی فراوانی سے بڑے بڑے کارخانے قائم ہوتے ہیں، جہاں لاکھوں مزدور معمولی اجرت پر کام کرتے ہیں، اور خاص طور پر وہ چیزیں پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جن میں زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو۔ اس طرح سرمایہ (Capital) اور محنت (Labour) میں کشاکش پیدا ہوتی ہے، اور مزدوروں میں ایک قسم کی باہمی یگانگی اور ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے۔ اس کے

برخلاف بڑے کارخانوں کے قیام سے چھوٹے کارخانے ختم ہو جاتے ہیں، اور چھوٹے سرمایہ داروں کا وجود بھی نہیں قائم رہتا، بلکہ سماج (Society) دو طبقوں (سرمایہ دار اور مزدور) میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مارکس کے خیال کے مطابق سرمایہ داری کا عروج خود اس کے زوال کی خبر دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اسی عروج سے بے خانماں مزدوروں کا طبقہ، جسے اشتراکی اصطلاح میں پرولتاری (Proletariate) کہتے ہیں، وجود میں آتا ہے، جو آخر سرمایہ دارانہ نظام کے لئے پیامِ موت ثابت ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ نفع اندوزی کے دُھن میں بسا اوقات سرمایہ دار چند مخصوص طبقوں کے لئے عیش و عشرت کا سامان تیار کراتا ہے، اور خود ان مزدوروں کے لئے جو یہ سامانِ عشرت تیار کرتے ہیں، ضروری چیزیں بھی تیار نہیں کی جاتیں، اس سلسلہ میں ایک اور بات ذہن میں رہے تو اچھا ہے۔ سرمایہ داری اپنے عروج میں نت نئے چولے بدلتی ہے۔ جب پیداوار حد سے بڑھنے لگتی ہے، اور اپنے مُلک کی قوتِ خرید جواب دینے لگتی ہے، تو اسے نئے بازاروں کی تلاش ہوتی ہے، اور موادِ خام کے لئے نئی زمینوں کی یہ تلاش آخر سامراج اور شہنشاہیت (Imperialism) کا سہارا لیتی ہے، لیکن شہنشاہیت کا لبادہ اوڑھتے ہی سرمایہ داروں کے درمیان باہمی رقابت کا شروع ہو جانا ناگزیر ہے۔ موادِ خام کے لئے نئی زمینوں اور مصنوعات کے لئے بازاروں کی تلاش میں وہ کشاکش ہوتی ہے، کہ عالمگیر جنگ کا سامنا ہوتا ہے۔ دنیا اس کشاکش کی تباہ کاریاں، بہت کچھ دیکھ چکی ہے، اور آج آپ جو کچھ دیکھ رہے ہیں، یہ سب اسی سرمایہ داری نظام کے کرشمے ہیں۔ سرمایہ داری نظام کی بنیاد پر کوئی صالح تمدّن قائم ہو ہی نہیں سکتا:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا (اقبال)

(ج) سرمایہ داری نظام اور مذہب یہاں ایک بات اور نہایت صفائی کے ساتھ عرض کر دینا ہے چونکہ معاشی مساوات کی نئی تحریکیں مذہب کی مخالف ہیں اور وہ مذہب کو سرمایہ داری نظام کا پاسبان شمار کرتی ہیں۔ اس لئے بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ سرمایہ داری نظام مذہب کا حامی تھا، اور حامی ہے۔ معاشی مساوات کی تحریکوں نے مذہب کو کیوں اپنا حریف سمجھ لیا؟ اس کی توجیہ سمجھ میں آسکتی ہے، جن دنوں یورپ میں یہ تحریکیں اٹھی ہیں، عام طور پر اہلِ کلیسا اخلاقی لحاظ سے انحطاط پذیر تھے۔ اور انھوں نے وقت کے جابر اقتدار پسندوں اور غیر عادلانہ طریقِ حکومت اور غاصبانہ نظامِ معیشت کی تائید اور حمایت میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس سے لازمی طور پر معاشی تحریکوں میں مذہب کے خلاف بھی ایک ردِّ فعل پیدا ہوا، جس نے آخر میں اشتراکیت کی شکل اختیار کرلی۔

لیکن یہ اس سے نہیں سمجھنا چاہیے کہ یورپ کا سرمایہ داری نظام مذہبی بنیادوں پر قائم ہوا تھا، یا اسے واقعی مذہب کے اصولوں سے کوئی محبت اور ہمدردی تھی۔ یہ واضح رہے کہ نظامِ سرمایہ داری بھی مذہب کا ایسا ہی شدید مخالف تھا، اور اس نے بھی مذہبی اصولوں کی بے وقعتی کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔ صرف اس حقیقت سے آپ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یورپ میں ملحدانہ تحریکوں کے فروغ، یا عیسائیت کے زوال کا ٹھیک وہی زمانہ ہے، جب صنعتی انقلاب کے بعد سرمایہ داری کو عروج حاصل ہوا۔

غلط فہمی نہ ہو، صرف پوجا پاٹ اور ظاہری رسموں کا نام مذہب نہیں۔ اس کی

آزادی نظام سرمایہ داری میں ضرور تھی، اور آج بھی انگلستان اور امریکہ میں پوجا پاٹ اور مذہبی رسموں کے ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ انگلستان میں تو ملکِ معظم کی ذات کلیسا کی سرپرست شمار کی جاتی ہے۔ لیکن افسوس کہ مذہب اِن چیزوں کا نام نہیں اللہ اور مذہب کو اجتماعی اور سیاسی زندگی سے بے دخل کرنے کی ابتدا، سرمایہ دار طبقہ ہی نے کی۔ اس طرح جہاں تک مذہب و اخلاق کے ساتھ بے اعتنائی، بلکہ دشمنی کا تعلق ہے، سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں ایک ہیں۔ آج یورپ اور ایشیا کے کسی خطے میں اگر کوئی دینی تحریک اجتماعی بنیادوں پر شروع کی جائے، تو آپ دیکھ لیں گے کہ سرمایہ دار اور اشتراکی طبقے اس کی مخالفت میں متحدہ محاذ قائم کرنے سے بھی دریغ نہ کریں گے دُور انگلستان اور امریکہ کیوں جائیے، انگلستان کے دو عزیز شاگردوں (مصر اور ہندوستان[1]) ہی کو دیکھ لیجیے، دونوں ملکوں میں خالص اسلامی بنیادوں پر دو تحریکیں ایک عرصہ سے کام کر رہی ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ دونوں جگہوں میں اشتراکی اور سرمایہ دار طبقے اُن کی مخالفت میں ہم زبان اور اشتراکِ عمل کر رہے ہیں —— اب رہی یہ بات کہ خود مذہب کا رویہ سرمایہ داری نظام کے معاملے میں کیا ہے۔ تو جہاں تک اسلام کا تعلّق ہے، وہ دونوں کا یکساں دشمن ہے۔ اور دونوں کو انسانیت اور اس کی فلاح وبہبود کے لئے تباہ کُن اور خطرناک سمجھتا ہے۔ تفصیل و توضیح آگے آئے گی۔

(۲)

معاشی اشتراکیت اور اس کے علم بردار

اشتراکیت آج کل جس کا اتنا شور سُنائی دیتا ہے، اصل میں سرمایہ داری نظام کے ردِّ فعل کا نام ہے۔ پہلے پہل یہ ردِّ عمل صرف معاشی پہلو لئے ہوئے تھا۔ سرمایہ داری نظام کے بڑھتے ہی یورپ میں ایسے لوگ

---

[1] میں ہندوستان کو اپنے وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں۔

پیدا ہونے لگے جنھوں نے مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کی، اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے عملی جدو جہد کی۔

گو آج کل دنیا میں جس اشتراکیت کا بول بالا ہے، (اور جو آج ہمارا موضوعِ سخن ہے) وہ مارکس کی انقلابی اشتراکیت یا "اشتمالیت" ہے۔ تاہم سرسری طور پر ان لوگوں کا ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، جنھوں نے مارکس سے پہلے معاشی مساوات کا خیال ظاہر کیا، اس کے لئے اپنی کوششیں صرف کیں، اور خود مارکس بھی ان کی تصنیفوں اور خیالات سے مستفید ہوا۔

(الف) ان لوگوں میں سین سیمون (St. Simon : ۱۷۶۰-۱۸۲۵) کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اُسے بعض معاشی مورخ سوشلزم کا باپ بھی کہتے ہیں۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے صنعتی انقلاب کے آثار دیکھ کر اس بات پر زور دیا کہ دولت کی پیداوار کے تمام ذرائع حکومت کے قبضہ میں ہونا چاہییں۔ گویا اس کی اشتراکیت، مملکتی اشتراکیت (State Socialism) کا ابتدائی خاکہ ہے۔

(ب) اٹھارہویں صدی کے اواخر میں فورئیر آے (Fourier : ۱۷۷۲-۱۸۳۷) پیدا ہوا۔ اقتصادی بدحالی اور مزدوروں اور سرمایہ داروں کے باہمی مقابلہ و پیکار سے متاثر ہو کر اس نے امداد باہمی کا اصول وضع کیا۔ اور یہ تجویز پیش کی کہ چار پانچ سو خاندانوں (یعنی قریب اٹھارہ سو آدمیوں) کی بستیاں قائم کی جائیں، جو معاشی اور سیاسی اعتبار سے بالکل خود مختار ہوں۔ اس کا خیال تھا، کہ اس قسم کی سوسائٹیوں یا بستیوں کے قیام سے نظامِ معیشت کی باہمی رقابت ختم ہو جائے گی۔

سین سیمون کے نظریہ کو تو مقبولیت حاصل ہوئی۔ خود مارکسی اشتراکیت میں اس کی

تعلیمات کا اثر موجود ہے، لیکن فوری اے کی تجویز پر کسی نے عمل نہیں کیا۔

(ج) روبرٹ اوئن (Robert Owen ۱۷۷۱ء-۱۸۵۸ء) نے بھی امداد باہمی کے اصول کی تعلیم دی۔ اس نے سارے سماج کی اصلاح کا ذمہ نہیں لیا۔ بلکہ اپنی نظر سرمایہ داروں اور مزدوروں کے مسئلوں پر قائم رکھی۔ اور اپنے دائرۂ عمل کو یہیں تک محدود رکھا۔ وہ خود ایک کارخانہ کا مالک اور منتظم رہ چکا تھا، اس لیے اس کے تجربات نہایت قیمتی تھے۔ انگلستان میں اس کے اصولوں نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ ایک حد تک ہم اُسے موجودہ اشتراکیت کا بانی بھی کہہ سکتے ہیں۔

(د) اشتراکیت کا چوتھا نقیب لوئی بلان (Louis Blance ۱۸۱۳ء-۱۸۸۲ء) فرانس کا ایک انقلابی تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مملکت (State) اپنے سرمایہ سے قومی کارخانے کھولے۔ اُن کے لیے کُل سامان فراہم کرے، دستور بنائے۔ کچھ دنوں تجربے کے بعد یہ کارخانے خود مختار کر دیئے جائیں۔ یعنی اخراجات اور آمدنی کی تقسیم، عہدہ داروں کا انتخاب اور کاروبار کی تدبیریں، کارخانوں کے مزدوروں اور کارکنوں پر چھوڑ دی جائیں۔ بلان کا خیال تھا کہ اگر ایک مرتبہ ایسے کارخانے قائم ہو گئے تو سرمایہ داری کی تمام خرابیاں دُور ہو جائیں گی۔ اس کے سیاسی حریفوں کی مخالفت کے باعث اس کی تجویز عملی جامہ نہ پہن سکی۔[۱]

---

[۱] ان اشتراکی مفکروں کے علاوہ اس سلسلے میں اور بھی نام لئے جا سکتے ہیں: اس مختصر سی کتاب میں زیادہ تفصیل ممکن نہیں۔ اس تھوڑی سی توضیح سے مارکس کے پیش رو اشتراکیوں کے خیالات اور طرزِ فکر کا اندازہ ہو جائے گا۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: (Laski) کی کتاب (Communism) صفحہ ۱۰-۲۰، مقالہ (Socialism) "انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج ۲۰ صفحہ ۸۹۰-۸۹۱ طبع چہاردہم)

(۴) نراج (Anarchism) ہم نے ابھی جن اشتراکی مفکروں کے نام لئے ہیں اُن کی تحریکیں زیادہ بار آور نہ ہو سکیں۔ اس لئے کہ وہ سرمایہ داروں کی اخلاقی حس سے[1] اپیل کرنا چاہتی تھیں۔ اور بدقسمتی سے سرمایہ داروں کے پاس اخلاقی حس کی قسم کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ مارکس کی انقلابی اشتراکیت کو جو کامیابی ہوئی اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے سرمایہ داروں سے اپیل تو درکنار انھیں خطاب کا بھی مستحق نہ سمجھا۔ اس کی اپیل براہِ راست مزدوروں سے تھی۔ "دولت آفرینی میں مزدور کا پلّہ بھاری ہے"۔ اس کی تعلیم کا خلاصہ تھا۔ مزدور کی اجرت کو سرمایہ داروں کی غیر مکتسب آمدنی unearned Income پر ترجیح دے کر اس نے مزدور کا سینہ غرور سے بھر دیا۔ اس نے اپنے پیش رو حامیانِ اشتراکیت کے برخلاف پہلی مرتبہ اس بات پر زور دیا کہ اشتراکیت کا قیام ایک اخلاقی مقصد نہیں، بلکہ ناگزیر تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہے۔

حقیقت میں اُنیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں سرمایہ داری نظام جس حد کو پہنچ گیا تھا

[1] ان اشتراکی مفکروں کو رائج الوقت سرمایہ داری نظام سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ ایک ظالمانہ نظام تھا، جس میں ایک چھوٹا مال دار طبقہ مخلوقِ خدا کا خون چوس رہا تھا۔ انھیں نظامِ سرمایہ داری سے اس لئے نفرت نہیں تھی کہ وہ ایک بوسیدہ نظام ہے، جو ایک خاص وقت کے لئے موزوں تھا، اور اب نئے حالات میں وہ نظام نہیں چل سکتا۔ یہ لوگ طبقاتی امتیاز کے بھی دشمن نہیں تھے، یہ اشتراکیت گویا ایک اخلاقی تحریک تھی، پروفیسر لسکی کے خیال میں مارکس کے پیش رو اشتراکی مفکروں میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ مقصد کو تو پا گئے تھے۔ سرمایہ داری کے مزاج اور اس کی تنگ ظرفی پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ وہ پیداوار اور ذرائع پیداوار میں شخصی ملکیت کے بھی مخالف تھے، اور ان کے نزدیک سرمایہ داری کے بُرے اثرات سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔ لیکن وہ تاریخ کا ایسا فلسفہ دریافت نہ کر سکے جو بیک وقت حصولِ مقصد کا معیار و اصول (Criterion) اور سماجی تبدیلی کی توضیح اور توجیہ بھی ہو۔ یہ کام مارکس کے لئے مقدر تھا اور اسی لئے مارکس کے بعد اشتمالیت ایک بالکل نیا رُوپ

اس کا لازمی نتیجہ ایک ایسی تحریک کا ظہور تھا، جو اسے چلا کر خاک سیاہ کر دے۔ مارکس کی اشتمالیت یا انقلابی اشتراکیت اُنیسویں صدی کے سرمایہ داری نظام اور کلیسا اور سرمایہ داروں کی ملی بھگت کی لازمی پیداوار ہے۔ اگر مارکسی اشتراکیت کا بول بالا نہ ہوتا، تو پھر دنیا کو اس سے بھی زیادہ خطرناک تحریک نراج (Anarchism) کی فتنہ سامانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا۔ یہ تحریک سرمایہ داری کے خلاف شدید ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔ اس کی دعوتِ عام اباحیت کی تھی۔ "ہر آدمی اپنے افعال میں خود مختار ہے، اس کے اقوال اور افعال پر کوئی پابندی نہیں ہونا چاہیے" اس کا شعار تھا۔ تاریخ میں اس سے پہلے صرف ایک ایسی تحریک مزدک ایرانی کے نام کے ساتھ وابستہ نظر آتی ہے، جس سے چھٹی صدی عیسوی میں فواحش کا ایک سیلابِ عظیم اُمنڈ پڑا تھا۔ لیکن نراج کی یہ تحریک مزدک ایرانی کی تحریک سے بھی زیادہ وسیع اور زیادہ خرمن سوز تھی۔ پر انسانیت کے لئے اچھا ہوا کہ یہ بے لگام تحریک پھل پھول نہ سکی، اور اس پر سب سے زیادہ کاری ضرب لگانے والا خود کارل مارکس تھا۔ معاشی لحاظ سے تو نراج اشتراکیت سے قریب ہے، لیکن یہ فرد کی آزادی پر حد سے زیادہ زور دیتی ہے، اور مملکت (State) کو تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے برخلاف اشتراکیت فرد کو جماعت کے ماتحت رکھتی ہے۔ نراج[1]

[1] سب سے پہلے پرودھون (Proudhou ، ۱۸۰۹-۱۸۶۵) نے ۱۸۴۰ء میں انارکزم کا لفظ اس سوسائٹی کے لئے استعمال کیا، جس میں کسی قسم کی حکومت کا اقتدار نہ ہو۔ پرودھون نے بے حکومت سوسائٹی کی تبلیغ کی، اور اس نے اشتمالیت اور مملکتی اشتراکیت (State Socialism) کی تمام صورتوں کی سخت مذمت کی (بریٹانیکا: مقالہ انارکزم، صفحہ ۸۷۴، ۱)۔ بکونن نے بھی اسے اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔

کا سرگرم داعی بکونن (Bakunin : ۱۸۱۴ - ۱۸۷۶) مارکس کا معاصر تھا۔ کچھ دنوں تک دونوں میں میل بھی رہا۔ پھر خوب معرکہ آرائیاں ہوئیں، جس میں مارکس کی جیت رہی۔ بکونن[1] خود بھی مارکس کی دماغی برتری کا قائل تھا، لیکن اُسے مکار سمجھتا تھا ـــــ اس موقع پر نراج کے متعلق اتنا عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا، کہ اس کے سرگرم داعی بکونن کی دعوت خاص طور پر تین چیزوں کی طرف تھی:

(۱) دہریت اور اس کی تبلیغ، یعنی خدا کے وجود کا مکمل انکار (Atheism)
لا ادریت (Agnosticism) نہیں، کہ "روشن خیالی" کے معیار سے یہ ایک درجہ نیچے ہے۔

(۲) مملکت (State) کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنا۔ مملکت چونکہ ظلم و تشدد کی مشین ہے، اس لیے اس کی قوت کو ختم کرنا ضروری اور ناگزیر ہے۔

(۳) سیاسی طریق کار بالکل بیکار اور قابل ترک ہے۔ مملکت کی تباہی سیاسی طریق کار سے نہیں، بلکہ بغاوت اور سازش سے ہو سکتی ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ انیسویں صدی کے بدترین حالات کے ردِ فعل کے طور پر نراج کی تحریک بھی ظہور میں آئی تھی۔ لیکن مارکس کی اشتراکی تعلیم اور اس کی قلمی معرکہ آرائیوں کے باعث برگ و بار نہ لا سکی، گو اس کے ماننے والے اور داعی بعد میں بھی پیدا ہوتے رہے۔ لیکن اشتراکیت کی سی کامیابی اور مقبولیت اُسے نہ حاصل ہو سکی۔

---

[1] بکونن کے بارے میں لسکی لکھتا ہے، "روسی انقلابی (بکونن) کی قوت اور جوش عمل کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ غور و فکر کی صلاحیتوں سے محروم تھا . . . . اس طرح کے دو لیڈر مشکل ہی سے ساتھ مل کر کام کر سکتے تھے۔ دونوں کے مقصد اور طریقے مختلف تھے۔" (صفحہ ۳۵ - ۳۴)

(۵)

اشتمالیت یا مارکسی اشتراکیت (Marxian Socialism)

مارکس (جس کا ذکر ابھی آتا ہے) سے پہلے کی اشتراکیت (جسے سوشلزم[۱] کے نام سے پکارا جاتا تھا) محض معاشرتی نظریہ کی حیثیت رکھتی تھی، جس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا، کہ شخصی ملکیت کو ختم کرکے دولت اور اس کی پیداوار کے ذرائع کو برابر برابر تقسیم کردیا جائے۔ لیکن مارکس نے اشتراکیت کو معاشی دائرے سے نکال کر ایک مربوط نظام حیات کی حیثیت دے دی۔ زندگی کے کسی ایک شعبے میں بنیادی انقلاب برپا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسرے شعبوں کو بھی از سرِ نو اُدھیڑ کر مرتب کیا جائے۔ اسی بناء پر مارکس کو پوری انسانی زندگی کے لئے ایک ایسا نظریہ اور ایک ایسا ایجابی فلسفہ وضع کرنا پڑا جو اُس کے معاشی نظریوں کے لئے اساس اور بنیاد کا کام دے سکے۔ اور چونکہ اشتراکیت کی تہ میں مادہ اور روٹی کے سوا کوئی چیز نہیں تھی، اس لئے جو نظریۂ حیات اور نظام فلسفہ اس کی فطرت سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے وضع کیا گیا، وہ سراسر ایک مادہ پرستانہ نظریہ اور نظام حیات بن کر رہا۔ اب آج ہم جس اشتراکیت سے دوچار ہیں، وہ یہی مارکسی اشتراکیت (اشتمالیت) ہے، جو صرف غریبوں اور مزدوروں کے معاشی مشکلات کا حل

---

[۱] اشتراکیت (سوشلزم) اور اشتمالیت (کمیونزم) کے باہمی فرق پر ابھی ہم لینن کی ایک تحریر کا ایک اقتباس دے چکے ہیں (ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۲۵) اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سوشلزم (اشتراکیت) اور کمیونزم (اشتمالیت) معاشی نظریہ کی تفصیلات میں بھی ایک دوسرے سے ایک حد تک الگ ہو جاتے ہیں، پھر بھی معاشی مساوات اور سرمایہ داری کے استیصال کے جذبہ میں اتحاد ہے۔

ہی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ اخلاق و تمدن و تہذیب کا ایک فلسفہ اور مابعدالطبیعی تخیلات کا ایک نظام بھی ہے۔ معاشی حیثیت سے بھی مارکسی اشتراکیت نے ایجابی سے زیادہ سلبی پہلو پر زور دیا، اس لئے اس کو انقلابی اشتراکیت بھی کہتے ہیں۔

اشتراکیت (سوشلزم) اور اشتمالیت (کمیونزم) کی معاشی تعلیمات میں مقصد کا زیادہ فرق نہیں، بلکہ اصل اختلاف جوڑ توڑ اور حکمتِ عمل کا ہے۔ "اشتمالیت" بھی اشتراکیت ہی ہے جو انقلابی طریقوں سے کام کرتی ہے، اور انقلابی طریق کار جس کے بنیادی اصولوں میں داخل ہے۔ اشتراکیوں کی طرح اشتمالی بھی ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت اور کنٹرول کے داعی ہیں، اور مملکت کے اقتدار کے ذریعہ سوسائٹی کے معاشی عوامل پر منظم قبضہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیوں سے ان کا اختلاف اس باب میں ہے کہ اُن کے خیال میں یہ قبضہ اور اقتدار صرف انقلابی طریقوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور صرف انقلابی عمل ہی اس بات کا ضامن ہوسکتا ہے کہ یہ ذرائع مزدوروں کے مفاد کے لئے استعمال کئے جائیں گے۔ اور صرف اسی طرح پرولتاری طبقے کی آمریت قائم ہوسکتی ہے، جو اس تبدیلی اور غریبوں کے مفاد کی ضامن اور محافظ ہوگی۔ موجودہ مملکتیں اور رائج الوقت پارلیمانی نظام جنھیں پُرانے سوشلسٹ معاشی تبدیلیوں کا آلہ اور ذریعہ بنانا چاہتے ہیں، اشتمالیوں کے نزدیک خالص سرمایہ داری نظام کے ادارے ہیں، جن کا قلع قمع کرنا اشتراکیت کے تعمیری کام سے پہلے ضروری ہے۔ یہ نظریہ مارکس کے "اشتمالی منشور" (جس کا بیان آگے آتا ہے) سے ماخوذ ہے (۱۸۴۸ء)۔ اور لینن نے اپنی کتاب (The State And Revolution) میں اسے پھیلا کر اور زور شور کے ساتھ بیان کیا ہے، جس سے اشتمالی پارٹی کے سیاسی نظریوں پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ یہیں سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ جو پُرانے سوشلسٹ (اشتراکی) مملکت اور پارلیمانی نظام کی موجودہ مشینری کو تدریجی سوشلزم (اشتراکیت) کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں، یا کرنا چاہتے ہیں۔ اشتمالیوں (کمیونسٹوں)

کی نگاہ میں مزدوروں کے بدترین دشمن شمار کئے جاتے ہیں، اور "منافق" شمار کرنے کی وجہ سے سرمایہ داری نظام کے حامیوں سے بھی زیادہ اُن کی مذمت کی جاتی ہے[1]

(الف) کارل مارکس (Karl Marx ۱۸۱۸ - ۱۸۸۳)

یہ یہودی مفکر جو آج اشتراکیت کا پیغمبر[2] تسلیم کیا جاتا ہے، رائن لینڈ (جرمنی) کے شہر ٹرائر (Trier) میں پیدا ہوا (۱۸۱۸ء)۔ یہودی النسل تھا، گو اس کا خاندان اس کے بچپن ہی میں (۱۸۲۴ء) برائے نام عیسائیت (پروتستنت) کا حلقہ بگوش ہو گیا تھا۔ لیکن یہ کم سنی ہی سے ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد تھا۔ تبدیلی مذہب سے وہ بالکل متاثر نہیں ہوا۔ بچپن ہی سے یہ بے باک، ضدی، اور ہٹ دھرم تھا۔ اپنی عقل کی پیروی کرتا، اور اپنے کو بے خطا سمجھتا تھا۔ ابتدا ہی سے اس نے جذباتِ کو عقل کا تابع رکھا۔ یہی وہ خصوصیات تھیں جو آگے چل کر اس کی بے پناہ انقلابی قوت کا باعث ہوئیں۔

اس کا باپ وکیل اور خوش حال تھا، اس لئے تعلیم اچھی ملی۔ طالب علمی ہی سے یہ بہت ہونہار تھا، بون (Bonn) اور برلن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ تاریخ، قانون اور فلسفہ اس کی دل چسپی کی چیزیں تھیں۔ خاص کر ہیگل کے فلسفہ کی طرف اس کی توجہ زیادہ رہی، جس کا اس زمانہ کی جرمن یونیورسٹیوں میں بہت چرچا تھا۔

۱۸۴۱ء میں اس نے اپنی رسمی تعلیم ختم کر لی، اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ رسمی

---

[1] مقالہ "سوشلزم" (برٹانیکا، ج ۲۰، ص ۸۹۴) از جی، ڈی، ایچ، کول [2] علامہ اقبال مرحوم نے مارکس پر کہا ہے ع نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب، لیکن اشتراکیوں کی عقیدت مندی اور نیاز مندی نے اسے اب خدائی کے درجہ پر پہنچا دیا ہے، اور اس کی جگہ اشتراکی مذہب کی پیغمبری کا منصب لینن (ف ۱۹۲۴ء) کو مل گیا ہے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ علمی زندگی گذارنا چاہتا تھا۔ بون پر اس کی نگاہ تھی۔ مگر اس کے خیالات مشہور ہو چکے تھے، اور یونیورسٹی کے کرتا دھرتا اسے کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ مجبوری میں اُسے صحافت[1] کے خارزار میدان میں قدم رکھنا پڑا، جس کے لئے وہ پہلے سے تیار تھا۔ طالب علمی ہی کے زمانہ میں (؟) کے افکار پختہ ہو چکے تھے۔ اس نے وقت کے رائج نظریوں سے خوب استفادہ کیا۔ یہ اُنیسویں صدی وسط تھا، انگلستان میں ریکارڈو[1] (Ricardo) اور آدم اسمتھ Adam Smith معاشیات کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے معاشی نظریے مقبولِ عام ہو رہے تھے، ادھر فرانس میں والٹیر (Voltaire) اور روسو (Roussau) کے سیاسی تصورات کی دھوم تھی۔ قدیم جبر و استبداد کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ اور مساوات و اخوّت کا نیا دور شروع ہو رہا تھا۔ ان دونوں سے الگ جرمنی پر ہیگل[2] کا فلسفہ چھایا ہوا تھا، اور لوگ مملکت[3] (State) کے ساتھ الوہیت کے جذبات وابستہ کرنے لگ گئے تھے۔ مارکس کے دورِ شباب میں خیالات کے یہ تین[3] دھارے بہہ رہے تھے، اور یہ اُن سب سے متاثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی تعلیمات میں فلسفہ معاشیات اور سیاسیات کی پوری آمیزش موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیم کے تین اہم حصّے (ا) تاریخ کی مادی تعبیر (ب) قدر زائد کا نظریہ (ج) طبقاتی تصادم، فلسفہ، معاشیات اور سیاسیات تینوں کی نمائندگی[4] کرتے ہیں۔

---

[1] ریکارڈو اور آدم اسمتھ اور ان کے زمانے (اُنیسویں صدی عیسوی کا آغاز) کے ماہرین معاشیات اور مارکس میں بڑا فرق یہ ہے کہ وہ سرمایہ داری کے عروج سے پہلے کے حالات کے نقاد تھے۔ سرمایہ داری نظام پر اُن کے نقد و جرح کی زد بہت کم پڑتی تھی۔ آدم اسمتھ اور ریکارڈو نے یہ واضح کیا کہ سرمایہ داری دنیا کو صنعت سے مالامال کر دے گی۔ یہ عمل ممکن سے ممکن سُرعت کے ساتھ پورا ہوگا۔ مارکس ان کے اس نتیجہ کو قبول کرتا ہے۔ لیکن وہ اس سے آگے بڑھ کر دکھاتا ہے کہ جب دنیا کو کارخانوں اور صنعتوں سے بھر دینے کا کام ایک حد تک پورا ہو چکے گا، تو کیا ہوگا۔

(اسٹریچی: صفحہ ۳۶۹) ۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۱۸۴۱ء سے اس کی عملی زندگی شروع ہوتی ہے۔ عملی زندگی سے مایوس ہونے کے بعد اس نے صحافت کی طرف توجہ کی۔ پہلے وہ ایک مقامی اخبار (Rhenische Zeitung) کے اسٹاف میں شامل ہوگیا۔ اور انتشار پسند خیالات کی تبلیغ کی۔ اکتوبر ۱۸۴۲ء میں ترقی کرکے اس کا ایڈیٹر ہوگیا۔ لیکن اس کے آتشیں قلم کی خرمن سوزیاں حکومت کی برداشت سے باہر تھیں۔ ۱۸۴۳ء کے آغاز میں اخبار بند کر دینا پڑا۔

ابھی وہ اپنے مقامی اخبار ہی میں تھا کہ بعض اشتراکی افکار، فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے اخبار میں شائع ہوئے۔ مارکس نے گو ان خیالات کی تائید نہیں کی، لیکن مکمل مطالعہ کے بغیر تنقید کے لئے بھی تیار نہیں ہوا۔ اس غرض سے ۱۸۴۳ء کے وسط میں پیرس میں آگیا جہاں ان دنوں اشتراکی خیالات دماغوں میں رچے ہوتے تھے۔ وہاں اس نے ایک دوست کے ساتھ جرمن زبان میں ایک رسالہ نکالا۔ مگر اس کا ایک ہی نمبر شائع ہوسکا۔ اس میں مارکس کے دو مضمون تھے، ایک یہودیوں سے متعلق تھا۔ دوسرے میں وقت کے معاشی خیالات پیش کئے گئے تھے۔ لیکن طریق بیان بدلا ہوا تھا۔ اور مضمون کے آخری جملے سیاسی انقلاب کی پیش گوئی کرتے تھے۔

پیرس میں گو اس کا قیام مختصر رہا، لیکن یہ مختصر زندگی بعض لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ یہیں اسے فریڈرک اینجلز (Friedrich Engels ؛ ۱۸۲۰-۱۸۹۵) جیسا وفادار رفیق ملا، جو آگے چل کر اس کے خیالات کا مستقل داعی بن گیا۔ اینجلز ایک مالدار کارخانہ دار کا بیٹا تھا، اور پہلے وہ رابرٹ اوئن سے متاثر ہوچکا تھا، اور اشتراکی رجحان رکھتا تھا۔ مارکس

(بقیہ حاشیہ سابق) ۵۲ مشہور جرمن فلسفی (۱۷۷۰-۱۸۳۱) ۵۳ ہیگل کی مملکت نہ تو کسی اصول کی پابند ہے اور نہ کسی حیثیت سے جواب دہ ہے۔ گویا وہ بالکل معصوم چیز ہے۔ جرمنی کی تباہ شدہ کلیت پسند (Totalitarian) مملکت ہیگل ہی کی ذہنی مخلوق تھی۔ ۵۴ ان نظریوں کی تشریح آگے آتی ہے۔

سے ملنے کے بعد وہ انقلابی اشتراکیت کا حامی ہو گیا۔ ان دونوں کی رفاقت ۱۸۴۴ء میں شروع ہوئی اور
اور مرتے دم تک قائم رہی۔ اینجلز (ف ۱۸۹۵ء) مارکس کے بعد بارہ برس زندہ رہا۔ اور برابر اشتراکی
خیالات کی تبلیغ کرتا رہا۔ اشتراکیت کی تاریخ میں اس کا مرتبہ مارکس کے بعد ہے۔
پیرس ہی میں اس نے ایک انتہا پسند رسالہ (Vormarts) میں مضمون لکھے۔ لیکن
اس کی پاداش میں رسالہ کا پورا اسٹاف فرانس چھوڑنے پر مجبور کیا گیا (۱۸۴۵ء)۔
اب مارکس، برسلز (Brussels) چلا آیا، جہاں کچھ دنوں بعد اینجلز بھی اُس سے آملا۔ برسلز
میں اس نے انارکزم کے داعی پرودھون پر سخت تنقیدیں کیں، اور اس کی تردید میں مستقل تصنیف
کی۔ مارکس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ معاشیات کے باب میں پرودھون کا کوئی خاص
انکشاف نہیں، اور اس نے انگلستان کے معاشی مفکروں کے خیالات کے دُہرانے کے سوا کچھ
نہیں کیا۔ ایک مبصر کا خیال ہے کہ مارکس کی تنقیدوں کی ضرب زیادہ تر پرودھون کے طرزِ بیان
پر ہے، نہ کہ اس کے افکار و خیالات پر[1]۔ برسلز میں مارکس اور اینجلز مزدوروں کی اشتراکی تحریک
سے زیادہ وابستہ ہو گئے۔ جرمن مزدوروں کی ایک انجمن قائم کی۔ ایک مقامی جرمن ہفتہ وار
اخبار Brusseller Detusche Zeitung کی خدمات حاصل کیں۔ اور پھر جرمن مزدوروں
کی ایک خفیہ اشتراکی جماعت "انصاف پسندوں کی انجمن" League of the just میں شامل
ہو گئے۔ اس خفیہ جماعت کی شاخیں لندن، پیرس، برسلز اور سوئٹزرلینڈ کے مختلف شہروں میں
پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ انجمن اب ان کے خیالات کی داعی بن گئی، اور نئے خیالات اور نئی سرگرمیوں
سے سازگار کرنے کے لئے اس کا نام بھی بدل کر اشتراکیوں کی انجمن League of the Communist
رکھ دیا گیا۔ یہیں ۱۸۴۷ء کے آخر میں مارکس اور اینجلز نے مشہور اشتراکی منشور Communist

[1] برٹانیکا، مقالہ "مارکس"، ج ۱۴ ص ۹۹۵)

Manifesto) لکھا، جس میں کائنات کا جدید تصوّر، مادیت، طبقاتی تصادم اور پرولتاری طبقہ کا تاریخی کام اور دوسرے مارکسی نظریوں کی توضیح و تشریح کی گئی ہے، اور جو اس وقت دنیا کے مزدوروں کے لئے پیامِ عمل، اور سرمایہ داروں کے خلاف اعلانِ جنگ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی پہلی اشاعت فروری ۱۸۴۸ء میں ہوئی۔

ابھی اشتراکی منشور شائع ہی ہوا تھا کہ فرانس میں انقلاب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور مارکس بلجیم سے جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ پیرس چلا آیا، اور وہاں سے جرمنی اور پھر کولون (Cologne) (مئی ۱۸۴۸ء) وہاں اس نے ایک اخبار جاری کیا۔ لیکن گوشۂ امن میسر نہ آسکا۔ اس پر مقدمہ چلا اور مئی ۱۸۴۹ء میں پروشیا کی حدود سے باہر رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے بعد اس نے پیرس کا رُخ کیا۔ اور وہاں سے بھی جون ۱۸۴۹ء میں نکلنے پر مجبور ہوا۔ آخر وہ لندن چلا آیا، جہاں اس نے اپنی عمر کے آخری ۳۴ برس انتہائی عسرت میں گذارے۔ اور یہیں ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر اپنے معاشی اور مادی نظریوں کی تشکیل اور تدوین کی۔ اخباروں کے لئے مضمون لکھ کر کچھ پیسے کماتا۔ پھر اینجلز کی مالی امداد اُسے قرض خواہوں کی لعنت سے بچاتی، تا آنکہ ۱۸۸۳ء میں اس کا پیمانۂ حیات لبریز ہو گیا۔

لندن کے قیام کے زمانہ میں گو اس کا زیادہ تر مشغلہ علمی رہا، لیکن وہ اس دوران میں بھی مزدوروں کی جدوجہد سے کنارہ کش نہیں ہوا ۱۸۶۴ء میں جب مزدوروں کی پہلی بین الاقوامی انجمن قائم ہوئی (جو بعد میں 'فرسٹ انٹرنیشنل' کے نام سے مشہور ہوئی) تو مارکس اس کی جنرل کونسل کا دل و دماغ بن گیا۔ تمام سکیمیں اور تجویزیں یہی مرتب کرتا، اور ممبروں کو سمجھاتا۔

(ب) مارکس کی تصنیفات

مارکس کی زندگی انتہائی کشمکش کی زندگی تھی۔ اربابِ قانون اس سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ وہ جہاں بھی رہا، قانون کا شکنجہ اس سے غافل نہیں تھا۔ آخر انگلستان میں اسے ایک گونہ چین و امن کی زندگی نصیب ہوئی۔ یہاں بھی عسرت دامن گیر تھی، جس کے

مقابلہ کے لئے اس کے پاس دماغ وقلم کے سوا کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ اس پریشانی میں اس نے
ہزاروں صفحے سیاہ کر ڈالے۔ ان تمام تحریروں میں تین چیزیں قابل ذکر ہیں،

(۱) اشتراکی منشور (Communist Manifesto)

(۲) نظام معیشت پر تنقید (A contribution to the critique of Political Economy)

(۳) سرمایہ (Capital)

اشتراکی منشور کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اور لندن کی پُرسکون علمی زندگی سے پہلے ہی جدو جہد کے دوران میں اس کی تصنیف عمل میں آچکی تھی۔ (۱۸۴۷-۴۸ء) اسے مارکسی اشتراکیت یا اشتمالیت کا سنگِ بنیاد بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ اس وقت دنیا کے مزدوروں کے لئے پیامِ عمل تھا اور سرمایہ داروں کے لئے اعلانِ جنگ۔ اس کی یہ انقلابی حیثیت اب بھی قائم ہے۔ اس کی تصنیف و ترتیب میں مارکس اور اینجلز دونوں شریک تھے۔ لیکن خود اینجلز کا بیان ہے، کہ موجودہ شکل میں یہ "منشور" مارکس ہی کا مسودہ ہے۔

فروری ۱۸۴۸ء میں پہلی مرتبہ اس کی اشاعت ہوئی۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے لبیک کی صدا بلند ہوئی۔ تقریباً پچھلی ایک صدی میں اس کے لاکھوں لاکھ نسخے مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

سب سے پہلے اسی منشور کے ذریعہ مارکس نے اپنے انقلابی نظریے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ یہ منشور تاریخ اور طبقاتی تصادم سے بحث کرتا ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ ذرائع پیداوار کی تبدیلی اور طبقات کی باہمی کش مکش کے ذریعہ کس طرح سوسائٹی کا ارتقا ہوا ہے؟ اور بکمال جرأت کے ساتھ سرمایہ داری کی زوال کی بھی خبر دیتا ہے۔

لینن کی زبان میں، ذہانت اور غیر معمولی قابلیت کے ساتھ صاف اور سُلجھے ہوئے اندازِ بیان

ہیں یہ منشور دنیا کا ایک نیا تصور پیش کرتا ہے۔ ایک با اصول مادیت سماجی زندگی پر چھائی ہوئی ایہ جدلیت کو ارتقا کا بہترین اور مکمل نظریہ بتاتا ہے، اور طبقاتی تصادم کے نظریے اور پرولتاری طبقے کے تاریخی کام کو نئی اشتمالی سوسائٹی کے موجد اور خالق کی حیثیت سے پیش کرتا ہے[1]۔

(۲) دوسری تصنیف "نظامِ معیشت کی تنقید" میں اقتصادی بحثیں ہیں، اور سرمایہ داری معاشیات کی تنقید اس کا موضوع ہے۔ اصل میں اس علمی کاوش سے اشتراکی منشور کی باغیانہ روح کے لئے سندِ جواز تلاش کرنا تھی۔ یہ اصل میں مصنف کی بڑی کتاب، "سرمایہ" کے ابتدائی ابواب کا کچا مسودہ ہے۔ گو اس میں بعض ایسی مفصل بحثیں بھی ہیں، جو "سرمایہ" میں اس پھیلاؤ کے ساتھ نہیں آسکی ہیں۔

(۳) اس کی تیسری کتاب "سرمایہ" ہے، جو عام طور پر اپنے جرمن نام (Das Kapital) سے مشہور ہے۔ یہ مارکس کے معاشی نظریوں کا نچوڑ ہے۔ اور خاص طور پر قدرِ زائد (Surplus value) کے نظرئے سے بحث کی گئی ہے۔ عام طور پر اسے سوشلسٹوں کا آسمانی صحیفہ کہا جاتا ہے : ع

نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

صرف پہلی جلد اس کی زندگی میں چھپی (۱۸۶۷ء) باقی دو جلدیں اس کے رفیقِ کار اینجلز کے اہتمام اور ترتیب سے ۱۸۸۵ء اور ۱۸۹۴ء میں شائع ہوئیں۔ یہ کتاب ہے تو سوشلسٹوں کا صحیفہ، مگر اعداد و شمار کے انبار اور طرزِ بیان کے اُلجھاؤ سے ایک چیستان بن گئی ہے، جو اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگوں کی سمجھ میں بھی ذرا مشکل سے آتی ہے۔ مرحوم علامہ اقبال نے شاید اسی طرف اشارہ کیا ہے:

تری کتابوں میں اے حکیمِ معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوطِ خم دار کی نمائش، مریز و کج دار کی نمائش،

[1] از Essay on Communist Manifesto Adoratsky ص ۶

یہ کتاب بہت مشکل شمار کی جاتی ہے۔ اس کے ابتدائی ۱۰۰ صفحے حد درجہ اُلجھے ہوئے ہیں۔ اچھے اچھے مومنین اشتراکیت، بھی اسے پڑھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اسٹریچی نے اپنی کتاب میں اس کے مطالعہ کے متعلق مناسب حدایات دی ہیں[1]۔ کتاب کی ضخامت بھی پڑھنے والے کو روکتی ہے۔ (پہلی جلد کے ۸۵۰ صفحے، دوسری کے ۶۰۰ صفحے ہیں، اور تیسری ۱۰۰۰ صفحوں سے زیادہ پر مشتمل ہے)

اس کتاب کی ژولیدہ بیانی کے باعث اس کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں، اور بہت سے خلاصے کیئے گئے ہیں۔ اس وقت اسٹریچی کا ملخص (Abridgement) ہمارے سامنے ہے۔ شروع میں ایک مختصر تعارف نامہ بھی ہے۔

(۷) اشتراکیت کا مادی فلسفہ | مارکسی اشتراکیت، اور اس کے ماتحت روسی انقلاب کی تاریخ اور تفصیل بیان کرنے سے پہلے اُس اشتراکی مادی فلسفہ کی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے، جو آج دنیا کے اشتراکیوں کا مرجع بن گیا ہے۔

موجودہ اشتراکیت کے بابا آدم مارکس کی تعلیمات میں بنیادی چیز اس کا مادی فلسفہ ہے، جسے اصطلاحی زبان میں جدلی مادیت (Dialectical Materialism) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جدلی مادیت سے مُراد وہ مخصوص زاویہ نگاہ ہے، جس کے ذریعہ ایک اشتراکی (Marxist) کائنات اور عالم کی تشریح اور تجزیہ کرتا ہے۔ اس زاویۂ نگاہ کو "جدلی مادیت" اس لیئے کہتے ہیں کہ مارکس کے مطالعۂ قدرت کا طریقہ جدلی ہے، اور قدرت کے متعلق اس کا بنیادی تصور مادی ہے۔ یعنی وہ قدرت کو ایک مادی چیز سمجھتا ہے۔ جدلی مادیت کے اصولوں کو اگر سماجی زندگی کے مطالعہ میں کام لایا جائے، تو اسی کو تاریخی مادیت (Historical Materialism) کہتے ہیں۔ یہ جدلی مادیت لینن (Lenin) کی زبان میں "مارکسیت" کی زندہ روح، اور اس کی بنیادی اصل ہے۔

Dialectics

[1] The Theory & Practice of Socialism) صفحہ ۴۶۶-۴۶۵

یونانی لفظ Dialego سے نکلا ہے۔ "جدلیات" سے مراد تھا، مخالف کی دلیلوں میں تضاد کے پہلو نکال کر اُسے قائل کر دینا۔ عہدِ قدیم میں فلسفی یہ سمجھتے تھے کہ خیالات اور دلیلوں میں تضاد کے پہلو نکال کر حقیقت تک پہنچنے کا بہترین راستہ تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ "جدلی طریقہ" بعد میں قدرت کے مظاہر سمجھنے میں استعمال کیا جانے لگا۔ مارکس، ہیگل[1] کا خوشہ چیں اور ایک معنی میں اس کا شاگرد ہے۔ اُس نے مادی فلسفہ کی اساس ہیگل ہی سے مستعار لی ہے۔ گو دونوں کے طریقِ استدلال اور برتنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہیگل کے نزدیک کائنات، تصورات (Ideas) کی ارتقائی حرکت کا نام ہے۔ یہ ارتقا تصورات و افکار کی باہمی کشمکش اور تضاد کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی اور حرکت کی تہ میں یہی تضاد اور کشمکش کارفرما ہے۔ ہر تصور (Idea) اپنے اندر اپنا ضد لئے ہوتے ہے۔ ہر اثبات اپنے دامن میں نفی پوشیدہ رکھتا ہے۔ کائنات کے ارتقا میں یہ ایجابی اور سلبی طاقتیں ٹکراتی ہیں۔ اور اُن سے ایک نیا اثبات پیدا ہوتا ہے، جو پہلے اثبات سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا ہے، اور اسی طرح ارتقا کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہیگل نے اپنے اس اثبات، نفی، اور ترکیب کے ذریعہ سے تمام کائنات کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ مادہ کا وجود تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ذہنی عین، یا تصور ہی کو سب کچھ کہتا ہے۔ اس کے خیال میں مادہ اور یہ خارجی دنیا سب اسی تصور یا ذہنی عین کے مظاہر ہیں۔ گو یہ جدلیت، خواہ مخواہ وجودِ باری کے انکار کی طرف لے جاتی ہے، اور اسی بناء پر بعض عیسائی کلیساؤں نے ہیگل کا فلسفہ پڑھنا ممنوع کر دیا تھا، پھر بھی ہم ہیگل کو وجودِ باری کے تصور کا منکر نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ اس کے ہاں ایک تصورِ مطلق (Absolute idea) کا تصور موجود ہے، جہاں کائنات

---

[1] ہیگل مشہور جرمن فلسفی (۱۷۷۰ - ۱۸۳۱)۔ لینن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ہیگل کو سمجھے بغیر مارکس کی Kapital کا سمجھنا ناممکن (Unintelligible) ہے۔

کی ارتقار ختم ہوتی ہے۔ اور جسے وہ خالق کے تمام اختیارات سے بھی مسلح کر دیتا ہے۔ گویہ تصوّرِ مطلق اسلامی تصوّرِ الٰہ کے لحاظ سے بالکل ناقص ہے، تاہم کسی نہ کسی حد میں وجودِ باری کا تصوّر ہیگل کے ہاں موجود ہے۔

مارکس نے اپنے مادی فلسفے کی بنیاد ہیگل کے اسی جدلی ارتقار پر رکھی، اور یہ نظریہ اُس نے ہیگل ہی سے مستعار لیا، جس کا اُسے خود اعتراف ہے۔ لیکن اس کے نظریہ کے برتنے میں اُس کی راہ ہیگل کے بالکل برعکس ہوگئی۔ ہیگل کے نزدیک ذہنی عمل یا تصوّر ہی آخری حقیقت تھی۔ مارکس نے اپنے استاد کی تعلیم بالکل اُلٹ دی۔ اُس نے کہا کہ مادہ ہی سب کچھ ہے۔ اور تصوّرات کی کش مکش ہماری اس مادی دنیا کی کش مکش کا محض عکس ہے۔ وہ روح یا کسی اَن دیکھی دنیا کا یکسر منکر ہے۔ اس کے نزدیک مادہ ہی ہر چیز کی اصل ہے۔ یہی بنیاد اور واقعیت ہے۔ مادہ کو کائنات کی اصل مان کر مارکس نے ہیگل کے جدلی فلسفہ اور طریقِ استدلال کو دنیا کی پوری تاریخ پر استعمال کرنا شروع کر دیا، نیز مذہب اور تمام ذہنی تحریکات کو مادی تحریکات کے عمل اور ردِّ عمل کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی۔

ہیگل کی 'جدلیت' اور مارکس کے 'نظریۂ جدلیت' اور دونوں کے باہمی فرق کو ہم ایک دوسری طرح پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں؛

آپ یوں سمجھیں کہ ہیگل کے نزدیک تاریخِ عالم کی حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ تصوّرات (Ideas) و افکار کی تاریخ ہے۔ ہر تصوّر جب تسلیم کر لیا جاتا ہے تو اس کے اندر سے ایسا تصوّر نمودار ہوتا ہے جو اس کی نفی ہوتی ہے۔ ان دونوں تصوّروں میں کش مکش ہوتی ہے، اور ان کے باہمی پیکار و کشمکش سے ایک نیا بلند تصوّر برآمد ہوتا ہے۔ جو پھر کچھ عرصہ کے بعد ایک دوسرے تصوّر کو جنم دیتا ہے، جو اس کی نفی ہوتی ہے۔ اور پھر دونوں کے پیکار اور کش مکش سے ایک تیسرا نیا بلند تصوّر پیدا ہوتا ہے۔

یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے، اور ہیگل کے نزدیک دنیا تصورات کے اسی کش مکش اور ارتقاء کا نام ہے۔

تصوّرات کی اس جنگ و پیکار کی جگہ مارکس معاشی عوامل اور ان کی باہمی کش مکش کو دیتا ہے جو اُن سماجی طبقوں کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، جو خود انھی عوامل (Forces) کی پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ معاشی عوامل کا ایک نیا مجموعہ (Set) ایک مخصوص طبقہ برسرِ اقتدار لاتا ہے، اور یہ با اقتدار طبقہ مملکت (State) کو اپنے تصوّر (Image) کے مطابق ڈھال لیتا ہے تاکہ اپنے احکام سوسائٹی پر نافذ کر سکے۔ لیکن کوئی طبقہ اس طرح دیر تک حکمراں نہیں رہ سکتا۔ ایک حریف طبقہ کا پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ ہیگل کی "جدلیت" آپ اور واضح طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں

تاریخ کے ایک مخصوص دَور میں تصوّرات کا ایک خاص مجموعہ غالب ہوتا ہے جو اس دور کے مذہبی، سیاسی اور اخلاقی نقطہ ہائے نظر کو معین کرتا ہے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ایک ردِ فعل شروع ہوتا ہے، اور تصورات کا ایک نیا مجموعہ اپنی برتری ثابت کرنا چاہتا ہے، تاآنکہ رفتہ رفتہ تصوّرات کے پُرانے مجموعے پر یہ چھا جاتا ہے۔ نئے تصوّرات کی کامیابی تاریخ کا ایک نیا دَور لاتی ہے، ایک ایسی منزل جو گو اپنے پیش رو کی نفی کرتی ہے، لیکن پہلے سے زیادہ جامع اور عالمگیر ہوتی ہے، چونکہ یہ نیا دور یا نئی منزل اپنے اندر پچھلے دَور کے تمام اقدار محفوظ رکھتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس جدلی عمل (Dialectic Process) میں حقیقی محرک کیا چیز ہے، جس کی وجہ سے ہر تحریک اپنے بطن سے ان رجحانات کو پیدا کرتی ہے، جو آخر میں اس کے زوال کا باعث ہوتے ہیں؟ یہاں مارکس کی راہ ہیگل سے الگ ہوتی ہے۔ اس نے منطقی نظریہ تو پورا پورا قبول کر لیا۔ خالص منطق (Logic) کی حیثیت سے "جدلیت" نہ تصوری ہی،

نہ مادی، اگو ہیگل نے اسے تصوری مابعد الطبیعات کے لئے برتا اور استعمال کیا۔ اس کے برعکس مارکس
نے تاریخ کی مادی تعبیر اور توضیح میں اس سے کام لیا۔ اس کے نزدیک مادی دنیا سے الگ تصورات
کی کوئی حیثیت نہیں، اور نہ ان کا وجود حقیقی ہے۔ تصورات، ایک ثانوی چیز ہیں۔
اس بنیاد پر ہیگل کے برخلاف مارکس کہتا ہے کہ تبدیلی کا حقیقی محرک ایک مخصوص سوسائٹی
کی معاشی ضروریات ہیں۔ سوسائٹی کی یہ قوت، جو اس کی معاشی ضروریات کو فراہم کرتی ہے (اور جسے
وہ 'وسائلِ پیداوار' کا نام دیتا ہے) اصل میں یہی قوت ہماری سماجی زندگی کے اہم تغیرات کو معیّن کرتی
ہے۔ تاریخ کے عمل ارتقا میں سب سے بڑا اور موثر عامل وسائل پیداوار کی روز افزوں ترقی ہے۔
اور یہی وہ چیز ہے، جو لوگوں کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس معنی میں کہ ہر شخص زیادہ سے
زیادہ وسائل پیداوار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے ــــ یہی چیز مارکس کے اُس نظریے کی بنیاد ہے جسے وہ
طبقاتی تصادم (Class struggle) کے نام سے پیش کرتا ہے۔

(۶)

(د) طبقاتی تصادم

مارکس کے فلسفہ کا سنگِ بنیاد تو وہی "جدلی مادیت" ہے جس کی تشریح ابھی کی گئی۔ طبقاتی تصادم
اور تاریخ کی مادی تعبیر کے نظریے اُسی کے شاخسانے ہیں۔
ہم پہلے طبقاتی تصادم کو لیتے ہیں۔ مارکس کے نزدیک جب ایک معاشی نظام، ترقی
کی ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے، تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہو کر اپنے
زمانہ کے حالات پیداوار سے متصادم ہوتی ہیں۔ یہ نئی قوتیں اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ مروجہ
معاشی نظام کو بدل کر طبقوں کی از سرِ نو تقسیم عمل میں لائی جائے، اور وہ نظامِ ملکیت بھی بدل دیا جائے

جو نئی پیداواری قوتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ یہ تبدیلی ان لوگوں پر قدرتی طور پر گراں گذرتی ہے جنھیں اب تک معاشی تنظیم میں دوسرے طبقوں پر غلبہ و اقتدار حاصل تھا۔ اور یہ لوگ ان نئی پیداواری قوتوں کے دبانے اور مٹانے میں اپنا زور صرف کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان نئی پیداواری قوتوں کی کامیابی و برتری کے ساتھ ان کے اقتدار و غلبہ کا خاتمہ بھی یقینی ہو جاتا ہے۔ ان غلبہ و اقتدار کے مالکوں کے مقابل سماج کے وہ مظلوم طبقے ہوتے ہیں، جنھیں مروّجہ معاشی تنظیم میں پیٹ بھر کر کھانا بھی بیسر نہیں آتا۔ وہ ان نئی پیداواری قوتوں کا خیر مقدم کرتے ہیں، اس لئے کہ ان نئی قوتوں کی کامیابی میں انھیں اپنی فلاح اور بہتری کی امید نظر آتی ہے۔ اس طرح پر ظالم و مظلوم اور غالب و مغلوب کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اسی کشمکش کو مارکس طبقاتی تصادم (Class struggle) کا نام دیتا ہے۔ ظالم و مظلوم کی یہ کشمکش اسی طرح جاری رہتی ہے، تا آنکہ سماج کے غیر متعلق طبقے بھی ایک نہ ایک فریق کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سوسائٹی صاف صاف دو طبقوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک وہ جو وسائل پیداوار کا مالک، اور دوسرا وہ جو ان سے محروم ہوتا ہے، اور اپنی بسر اوقات کے لئے پہلے طبقے کا دست نگر اور محتاج۔ اور آخر کار مظلوم طبقے کی فتح ہوتی ہے، اور وہ دولت کی پیداوار کے ذرائع و وسائل پر قابض ہو جاتا ہے۔ اس مظلوم طبقے کی فتح اصل میں نئی قوتوں کی فتح ہوتی ہے، جو مروّجہ معاشی نظام کے اندر سے پیدا ہوئی تھیں۔

مظلوموں کی فتح کے ساتھ ایک نیا معاشی نظام بنتا ہے، اور طبقات کی نئی تقسیم معرض وجود میں آتی ہے۔ اور اس نئے معاشی نظام کے مزاج اور مقتضیات کے مطابق مذہب، قانون، سیاست زندگی کے تمام شعبوں میں تبدیلیاں نمودار ہوتی ہیں۔ لیکن جب یہ نظام کچھ دنوں چلنے کے بعد تکمیل کو پہنچ لیتا ہے، تو اس پر بھی وہی جدلی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر سے بھی بعض نئی پیداواری قوتیں ابھرتی ہیں، اور حالات پیداوار سے ان کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور طبقاتی تصادم کے آثار

نمودار ہونے لگتے ہیں، تاآنکہ یہ نظام بھی تباہ ہو جاتا ہے، اور دوسرا نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

مارکس کہتا ہے کہ یہ طبقاتی تصادم اسی طرح عرصہ دراز سے جاری ہے۔ پہلے غلامی کا نظام تھا۔ اس کے بعد جاگیردارانہ نظام پیدا ہوا، لیکن جب جہازرانی کو ترقی ہوئی ور تاجروں اور کاریگروں کا نیا طبقہ وجود میں آیا، تو جاگیرداری نظام (Feudal system) بھی ختم ہوا، تاجروں اور کاریگروں کی فتح ہوئی، اور سرمایہ داری کا موجودہ نظام پیدا ہوا۔ اور جب اُنیسویں صدی میں یورپ کا سرمایہ داری نظام اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا، تو اس کے اندر سے بھی مخالف قوتیں نمودار ہونے لگیں۔ بے خانماں مزدوروں کا طبقہ (پرولتاریہ) ان ہی تازہ قوتوں کا مظہر ہے، جو سرمایہ داری کو ایک دن مٹا کر دم لے گا۔ یہ کشمکش عرصہ سے جاری ہے، اور مارکس کی پیشین گوئی کے مطابق یہ جدلی عمل (Dialectic Process) بہت جلد تکمیل کو پہنچ جائے گا، یعنی نظامِ سرمایہ داری کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام اخلاقی، تمدنی و سیاسی تصورات بھی کالعدم ہو جائیں گے، جو سرمایہ داری نظام سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ مزدوروں کو فتح حاصل ہوگی، اشتراکیت[1] کا دور دورہ ہوگا، نئے اقدار ہوں گے، اور نئے تصورات، جو اشتراکی نظام سے

---

[1] مارکس کے نظریے کے مطابق نظامِ سرمایہ داری کے ختم ہوتے ہی فوراً ہی اشتراکی نظام وجود میں نہیں آئے گا، بلکہ نظامِ سرمایہ داری کی تباہی اور اشتراکیت کے قیام کے درمیان ایک اچھا خاصا وقفہ ہوگا، جس میں پرولتاریہ کی آمریت قائم ہوگی۔ اس آمریت کے ذریعہ پُرانے نظام کے بچے کھچے عناصر کا قلع قمع کیا جائے گا۔ یہ آمریت ایک غیر محدود مدت تک رہے گی، روس آج کل اسی دور سے گزر رہا ہے۔ جب اس آمریت کا کام ختم ہو جائے گا، تو وہ خود میدان سے ہٹ جائے گی، اور مثالی سوسائٹی نمودار ہوگی۔ لیکن مبصروں کی رائے میں روس کی موجودہ پرولتاری آمریت میدان سے ہٹتی نظر نہیں آتی۔

بالکل ہم آہنگ ہوں گے۔

یہ ہے طبقاتی تصادم کے نظریہ کا خلاصہ۔ سرسری طور پر بھی اس میں متعدد خامیاں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:۔

(۱) جب مارکس کی پیشین گوئی کے مطابق اشتمالیت (Communism) کا دور دورہ ہوگا، اور سوسائٹی سے طبقات مٹ جائیں گے، تو پھر یہ جدلی عمل کس طرح جاری رہے گا؟ کیا مثالی سماج کے وجود میں آنے کے بعد جدلی عمل "ختم" ہو جائے گا؟ تو پھر "جدلی مادیت" کا فلسفہ غلط اور مہمل ثابت ہوا جاتا ہے۔ اور اگر مثالی سماج کے نمودار ہو جانے کے بعد بھی یہ طبقاتی تصادم جاری رہے گا، تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کی مثالی سوسائٹی میں بھی نقائص ہیں اور یہ دعویٰ کہ اشتمالی سوسائٹی میں ہر شخص کو اس کی ضرورت کی چیزیں بے کشمکش کے ملتی رہا کریں گی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ بہرکیف مارکس کی کتابیں اس کا تشفی بخش جواب نہیں دیتیں۔

(۲) طبقاتی تصادم کے سلسلہ میں مارکس کی بہترین پیشین گوئیاں صحیح نہیں ثابت ہوئیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے، مارکس کا خیال تھا کہ سماج کے مختلف طبقوں کے مفاد کا باہمی تضاد آخر ظالم و مظلوم کی ایک عالمگیر کشمکش کی صورت میں ہوگا، جس میں دنیا کے تمام مظلوم مل کر ظالموں کے مقابلہ میں صف آرا ہوں گے، اور پرولتاریہ آمریت قائم کر کے ایسی مثالی سوسائٹی کے لئے راستہ ہموار کریں گے، جہاں ظلم اور نوچ کھسوٹ (Exploitation) کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے گا۔ مارکس نے اس قسم کے طبقاتی تصادم کی صرف

(بقیہ حاشیہ ص ۳۷) اور مارکس کی موعودہ مثالی سوسائٹی (Classless society) کا تو ذکر کیا وہاں سوشلزم بھی دم توڑ رہی ہے۔ سامراجی تصور دن پر دن خداوندان روس کے دل و دماغ پر چھاتا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو مسانی کی (Socialism Reconsidered)۔

پیشین گوئی ہی نہیں کی، بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ اشتراکی نصب العین کے حصول کا اور کوئی راستہ نہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ واقعات بالکل مخالف سمت کو جا رہے ہیں۔ طبقاتی تصادم کی بجائے اب تک قومی رقابت ہی کا زور ہے۔ آج کی دنیا میں طبقات کے مقابلے میں قوموں کی رقابت اور ایک دوسرے پر تعدی زیادہ نمایاں ہے۔ اشتراکی منشور کی اشاعت کے بعد سے (۱۸۴۸ء) قوموں میں طبقاتی شعور کی جگہ قومی شعور بڑھتا ہی گیا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم اور موجودہ بڑی لڑائی سے یہ بات روشن ہوگئی کہ قومی مفاد کے سامنے مزدور اور سرمایہ داری طبقے اپنے طبقاتی مفاد کو فراموش کر جاتے ہیں، ورنہ جنگ کے دنوں میں انگلستان اور جرمنی کے مزدوروں کو اندرونی انقلاب برپا کرنے سے کون چیز مانع تھی؟

اور تو اور خود اشتراکی روس بھی اشتراکیت کی بجائے، قومی وطن (Father land) ہی کے نام پر جان و مال کی قربانی دے رہا تھا، اور آج وہاں ہمارا ملک Our Country اور وطن (Father land) ہی کے نام پر آمادہ عمل کیا جاتا ہے۔ بہرحال گذشتہ سو برس کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دنیا کے باشندوں کا قومی شعور اُن کے طبقاتی شعور سے زیادہ قوی ہے۔ اور یہ مارکس کے نظریے اور پیشین گوئیوں کی صریح تردید ہے۔

(۳) مارکس نے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ مزدوروں کی حالت روز بروز خراب ہوتی جائے گی۔ واقعات اس کی بھی تائید نہیں کرتے۔ دنیا کے تمام حصوں میں بلا استثناء مزدور طبقہ کی حالت پہلے سے بہتر ہوگئی ہے۔

(۴) مارکس نے یہ بھی کہا تھا کہ دنیا ظالم و مظلوم دو طبقوں میں صاف صاف بٹ جائے گی۔ یہ پیشین گوئی بھی صحیح نہیں ثابت ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض طبقے ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ مثال کے طور پر انگلستان کے مزدوروں کو لیجیے۔ وہ انگلستان میں مظلوم ہیں لیکن

دوسرے غلام ملکوں پر ظلم کرنے میں اپنے مالکوں کے ہم نوا ہیں، اور اس نظام پر قانع ہیں جو دنیا کی کروڑوں مخلوق پر طرح طرح کے ظلم ڈھا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مزدوروں کی انجمنوں کے سرمایے سرمایہ دار بنکوں اور کمپنیوں میں بھی لگے ہوئے ہیں۔[1]

(۵) اسی سلسلے میں مارکس کی ایک اور غلطی کی بھی نشان دہی کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس کے نظریے کی رو سے پرولتاری انقلاب کی ابتدا، اس جگہ ہونا چاہیے تھی، جہاں سرمایہ داری نظام اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہو، لیکن اس کی ابتدا، نہ جرمنی میں ہوئی، نہ انگلستان میں، نہ امریکہ میں، بلکہ ہوئی تو روس میں، جہاں سرمایہ داری نظام کی ابھی ابتدا، تھی، اور جاگیرداری نظام بھی اختتام کو نہ پہنچا تھا۔

(۷)

تاریخ کی مادّی تعبیر اور "لادینیت"

یہ بات کہ اشتراکیت اور لامذہبیت دونوں لازم و ملزوم ہیں، جدلی مادیت اور اس کے شاخسانہ "تاریخ کی مادی تعبیر" (تاریخی مادیت) کی تھوڑی سی مزید تشریح سے بالکل واضح ہو جائے گی۔ جدلی مادیت اور طبقاتی تصادم کی توضیح تو ابھی کی جا چکی ہے۔ اب آپ تاریخی مادیت کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوتا آیا ہے، وہ طبقاتی تصادم کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ایک نظام معیشت کچھ دنوں چلتا ہے، پھر معاشی رفتار کے اقتضا کی بنا، پر خود اُسی کے اندر اس کی حریف طاقت پیدا ہو جاتی ہے، اور دونوں کی ٹکر سے ایک نیا نظام نمودار ہو جاتا

[1] برٹرنڈرسل کی کتاب "آزادی کی راہیں" (Roads to Freedom) صفحہ ۱۵۵-۱۵۴

جو پہلے سے بلند ہوتا ہے اور جس میں پہلے نظام کے اچھے اجزا شامل ہوتے ہیں۔ مارکس[1] کے نزدیک دنیا کی پوری تاریخ معاشی مصالح کے اسی عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ مذہب ہو یا اخلاق اس کے دائرۂ عمل سے کوئی چیز باہر نہیں۔ آپ ایک اشتراکی سے پوچھیں گے کہ حضرت عیسیٰؑ کی روحانی تعلیمات کے کون سے معاشی محرکات تھے؟ وہ ضرور کوئی نہ کوئی بات نکال کر کہے گا۔ راقم کبھی کبھی سوچا کرتا کہ آخر یہ لوگ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں کن معاشی عوامل کی کارفرمائی دکھاتے ہوں گے؟ لیکن یہ حیرت دیر تک باقی نہ رہی۔ ملک کے ایک مشہور اشتراکی عالم (M.N. Roy[2]) نے اپنی کتاب اسلام کا تاریخی کارنامہ (Historical Role of Islam) میں رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو مادی قدروں (Values) کے ذریعہ سمجھانے کی ناکام اور احمقانہ کوشش کر ہی ڈالی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کو پیٹ اور روٹی کے واسطے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرنا تاریخ سے انتہائی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہ اصل میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم اور بعد کے مسلمان بادشاہوں کی فتوحات کے درمیان فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ معاشی حالات تاریخ کی تشکیل میں مؤثر ہوتے ہیں اور رہتے ہیں۔ مگر

---

[1] مادی زندگی میں طریقِ پیداوار ہی زندگی کے روحانی، سیاسی، اور سماجی عمل کا رخ متعین کرتا ہے۔ انسان کا شعور ان کے وجود کا ضامن نہیں، بلکہ اس کے برعکس ان حالات کا سماجی وجود انسانی شعور کی نوعیت کی تعیین کرتا ہے۔ (مارکس: بحوالہ اسٹریچی، ص ۳۶۶۔)

[2] ایم۔ این۔ رائے سے کسی سوشلسٹ یا کمیونسٹ کو کتنا ہی اختلاف ہو، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں شاید ہی دو چار آدمی ایسے ہوں جو "مارکس" اور "مارکسیت" کے سمجھنے میں اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکیں۔

اس طرح نہیں کہ ساری تاریخ ہی معاشی کشمکش کا نتیجہ ہو کر رہ جائے۔ معاشی حالات کے علاوہ دوسرے عوامل بھی ایک عہد کے تمدن، فلسفہ اور سیاست کی تکوین و تشکیل میں کافی اثر انداز ہوتے ہیں۔ پچھلے زمانوں میں سیاسی اور سماجی انقلابات صرف مادّہ ہی کی کشمکش سے نہیں پیدا ہوئے۔ معاشی مصالح کی طرح ہزاروں لاکھوں انسانوں نے صرف مذہبی تعلیمات کے زیرِ اثر بھی لڑائیاں لڑی ہیں۔ مختلف قوموں کے درمیان صلح ناموں اور معاہدوں کی تکمیل میں معاشی سے زیادہ نسلی، تمدنی اور مذہبی عوامل کا دخل ہے۔

ان مختلف عوامل کے علاوہ بسا اوقات غیر معمولی اشخاص بھی تاریخ کا رُخ بدلنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی بعض اتفاقی حادثات بڑی بڑی خوں ریز لڑائیوں کا باعث ہو جاتے ہیں۔ مگر مارکس اور اس کے ماننے والے یہ ماننے کو تیار نہیں۔ ان کے نزدیک اشخاص کی کوئی قیمت نہیں۔ مارکس کے نزدیک اشخاص اپنے زمانے کے معاشی مؤثرات کے ہاتھ میں کھلونے کی طرح کام کرتے ہیں، گو یہ حقیقت اور مشاہدہ کے کتنا ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ خود روس کے اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷ء) میں لینن کی شخصیت نے معمولی کام نہیں کیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اشخاص اپنے زمانے کے رجحانات اور معاشی و سیاسی عوامل سے متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ ان سیاسی رجحانات و عوامل پر بھی شخصیتوں کا گہرا چھاپ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ ساری تاریخ معاشی مصالح کے عمل و ردِ عمل کا نتیجہ ہے، صحیح نہیں ہو سکتا۔

بہر حال مارکس کا یہ خیال کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا ہے، وہ طبقاتی اور معاشی کشمکش

ؔلہ اس نظریے کو مارکس کے یارِ غار اینجلز نے ایک جگہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے (اسٹرکچی ص ۲۵۸):
"تاریخ کے مادی تصور کا آغاز اس اصول سے ہوتا ہے کہ پیداوار اور پیداوار کے ساتھ (باقی حاشیہ ص ۴۳)

کی ایک داستان ہے (خواہ وہ کتنا ہی مہمل ہو)، مان لینے کے بعد کسی مذہب کی گنجائش نہیں باقی رہتی - کوئی وحی، نبوّت، الہام تسلیم نہیں کیا جاسکتا - وہ فلسفہ جو نری مادیت پر مبنی ہے، جو دنیا کو صرف ذرّات کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، وہاں کسی مذہبی یا روحانی تصوّر کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اُن کے ہاں مادہ ہی سب کچھ ہے۔ روٹی ہی خدا ہے انسان اپنی دنیا کا آپ خالق اور ناظم ہے۔ کسی غیر مرئی خالق کائنات کا تصوّر ہی ممکن نہیں۔

خلاصہ یہ کہ اشتراکیوں کے عمل سے قطع نظر بھی کرلیں تو جہاں تک مارکس کے مادی فلسفے کا تعلق ہے، یہ اور مذہب ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ اشتراکیت اور مذہب ایک دوسرے کی نقیض ہیں، اور پھر اسلام؟ جو عقائد وعبادات کے مجموعہ کے علاوہ زندگی کا ایک مربوط نظام عمل اور حکومت ومعاشرت کا مکمل دستور العمل بھی ہے، اُس سے اور اشتراکیت سے کیا تعلق؟ جہاں تک بنیادی تعلیم اور فلسفۂ حیات کا تعلق ہے، اشتراکیت اور اسلام دو متضاد چیزیں ہیں۔ اسلام کا آغازِ فکر، خالق کائنات کے تصوّر سے ہوتا ہے۔ پہلے خالق کا تصوّر رہتا ہے، اس کے بعد اور کچھ۔ اشتراکیت کا نقطۂ آغاز، روٹی اور مادہ ہے، پھر دونوں کہاں مل سکتے ہیں؟ اشتراکیت کی بنیاد "نری مادیت" ہے، جو کبھی انسان کو تشفی نہیں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲) ذرائع تبادلہ ہر سماجی نظام کی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ کے تمام ادوار میں پیداوار کی تقسیم اور سماج کی طبقہ واری تفریق میں اس بات کا دخل رہا ہے کہ پیداوار کیا ہے اور کس طرح یہ پیداوار وجود میں آتی ہے اور یہ کہ ان کا تبادلہ کس طرح عمل میں آتا ہے۔ اس تصوّر کے مطابق سماجی تبدیلیوں اور سیاسی انقلابات کے اسباب کی تلاش میں اشخاص کے دماغ اور ان کی دور رس اور حقیقت شناس نگاہوں کی طرف رُخ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ان کی بجائے طریق پیداوار اور طریق تبادلہ میں ان اسباب کا سُراغ لگانا چاہیے۔ فلسفہ کی بجائے اس عہد کی معاشیات میں ان اسباب کی تلاش کرنا چاہیے۔"

دے سکتی۔ مادیت کا لازمی نتیجہ "لذتیت" ہے، جس پر نظام اجتماعی کو کسی طرح استوار نہیں کیا جا سکتا۔ مادیت کا یہ طوفان سب سے بڑا خطرہ ہے، جو اس وقت انسانیت کو درپیش ہے۔ اسلام اس کا سخت ترین مخالف ہے۔ وہ انسان کو حیوان نہیں رکھنا چاہتا۔ خالق کائنات کا تصور انسانیت کی سب سے اعلیٰ قدر ہے اور اس کے تحت میں وہ تمام کائنات کی زندگی کو منظم کرنا چاہتا ہے۔ اشتراکیت اور لادینیت کے طبعی لزوم پر ہم نے اب تک جو کچھ لکھا ہے وہ صرف مارکس کے مادی فلسفہ کی بنیاد پر ہے، گو یہ تشریح اپنی جگہ پر قطعی ہے، اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ تاہم عام ناظرین کے مزید اطمینان اور واقفیت کے لئے مشہور اشتراکی مفکر کامریڈ ام ان رائے (جن کی ایک کتاب کا ذکر ابھی آچکا ہے) کے ایک مضمون کا اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

"سوشلزم کا فلسفہ مادیت ہے، جو مذہب کو پس پشت ڈال دیتی ہے اور روحانیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ دوسرے لفظوں میں زندگی اور مخلوقات کے مذہبی نظریے کی تردید کرتی ہے۔ سوشلزم اور مارکس کی تعلیمات کا بنیادی جزو جدلی مادیت ہے ...... پہلے فلسفہ کے ذریعہ دنیا کی تشریح کی جاتی تھی۔ مستقبل میں اس کا منصب بدل جائے گا۔ اب یہ دکھانے کی کوشش کی جائے گی کہ انسان کس طرح دنیا کی دوبارہ تعمیر کر سکتا ہے ...... اس کے یہ معنی ہوئے کہ مارکس کے فلسفہ میں انسان کسی قدرتی طاقت کے ہاتھ میں آلۂ کار نہیں ہے۔ انسان اس دنیا کا جس میں وہ رہتا ہے، خالق ہے، انسان سوسائٹی کا خالق ہے"۔

یہ ایک طویل خطبہ کے اقتباسات ہیں جو ان کے اخبار انڈی پنڈنٹ انڈیا میں شائع ہوا تھا۔ بحث کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

بہرحال ایک شخصی خدا (Personal God) کا عقیدہ ہو، یا عبادت کی تاثیر کا، یا عالم کا مذہبی تصور ہو......... یہ بالکل واضح ہے کہ ان تصورات میں سے کوئی بھی کسی طرح مارکسی نظریۂ حیات اور انسانی جدوجہد سے میل نہیں کھا سکتا۔"

(انڈی پنڈنٹ انڈیا، ۲۲ جنوری ۱۹۳۹ء)

تنقید اور جائزہ آئیے، اب ہم ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ مارکس کے ان نظریوں (جدلی مادیت، طبقاتی تصادم، تاریخی مادیت) میں غلطی اور خرابی کی بنیاد کیا ہے؟ ہمارے خیال میں، مارکس کی سب سے بڑی غلطی وہ غیر معمولی اہمیت ہے، جو اس نے انسانی زندگی میں معاشی عوامل کو عطا کی ہے۔ اس کی پیدائش ۱۸۱۸ء میں ہوئی، جب کہ انقلاب فرانس (۱۷۸۹ء) کی یاد ابھی دلوں میں تازہ تھی۔ وہ عظیم الشان معاشی انقلاب جو علوم و فنون کے نئے اکتشافات سے ظہور میں آیا، اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس نئے صنعتی انقلاب کے باعث جو غیر معمولی تبدیلیاں یک بیک نمودار ہوئیں، اُن کا یہ لازمی نتیجہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں پر معاشیات کی برتری اور غیر معمولی اہمیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور معاشی قوانین کی عملی کامیابیوں نے یہ خیال جاگزین کرنا شروع کر دیا، کہ صرف معاشیات ہی کے ذریعہ زندگی کی تمام گتھیاں سُلجھائی جا سکتی ہیں۔ مارکس کے ہاں یہ خیال اپنے پورے عروج میں نمودار ہوا اور اس نے معاشی عوامل کو فلسفۂ حیات کی بنیاد قرار دے لیا۔ رنج کی بات یہ ہے کہ یہ رجحان گو اُنیسویں صدی عیسوی کے مخصوص حالات کی پیداوار تھا، اب تک قائم ہے اور آج بھی ہماری زندگی کی تمام قدریں (Values) خواہ مذہبی ہوں یا تمدنی، یا سماجی، سب کی سب معاشی قدر ہی کی روشنی میں دیکھی جاتی ہیں۔

یہ تو مارکسیت کی کارفرما روح تھی۔ اسے مسلح کرنے کے لئے اس نے ہیگل کے

اسلحہ خانہ سے جدیت کی تلوار چرائی، مگر اس کی دھار اُلٹ دی۔ تاریخی ارتقاء میں "جدلیت"
کا عنصر اس حد تک تو تسلیم کرنا ممکن ہے کہ بسا اوقات متضاد عوامل کے تصادم سے اس کا
خمیر تیار ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تقریباً تمام سوسائٹیاں اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد زوال
سے دوچار ہوتی ہیں، جب ان کا مقابلہ ایسی تہذیبوں سے ہوا جو نئے اقدار (Values)
کی علم بردار تھیں، لیکن یہ ماننا ناممکن ہے کہ عروج وزوال کا یہ عمل متناقض عوامل کے
تصادم اور ٹکراؤ ہی سے رونما ہوتا ہے۔ ایک مخصوص دَور کو جاگیرداری کا نام دینا، اور
اس کے بعد والے عہد کو "سرمایہ داری" کے نام سے پکارنا، اور پھر یہ دعویٰ کرنا کہ پچھلا اگلے
کی نقیض اور ضد ہے، ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں، اور واقعات سے اس طرح کے برخود
غلط نتیجے نکالنا تاریخ پر بڑا ظلم ہے، جس کا کوئی سنجیدہ طالب علم (Scholar) ارتکاب نہیں
کرسکتا۔ تاریخ کے ایک مخصوص دَور پر مختلف نقطہ ہائے نظر سے نظر ڈالی جاسکتی ہے، اور
الگ الگ نام دیے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہم پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی
کو یورپ میں "اصلاح مذہب" کا دَور کہہ سکتے ہیں۔ دوسرے نقطۂ نظر سے جغرافی انکشافات
یا قومی مملکتوں (States) کی تاسیس کا عہد بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی
عیسوی کو مختلف اعتبارات سے صنعتی انقلاب یا سامراج، یا قومیت، یا عقلیت کا دَور
کہا جاسکتا ہے۔ تاریخی ارتقاء، تضاد وتناقض کے ذریعہ مکمل ہوتا نہیں معلوم ہوتا منطق
(Logic) کی طرح تاریخ کے قوانین لگے بندھے نہیں ہوتے۔ اس کا ارتقاء حالات
وماحول کے لحاظ سے کبھی تیز، کبھی سست، کبھی تدریجی، کبھی غیر متوقع انقلاب کے ماتحت
عمل میں آتا ہے۔ کبھی حالات کی رفتار ایک مدّت کے لئے جمود اختیار کرلیتی ہے۔ کبھی زمانہ
ایسی کروٹ لیتا ہے کہ پرانے دَور کے آثار بالکل ملیامیٹ ہوجاتے ہیں، اور نیا دَور

بالکل ازسرِ نو نئی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، جس میں پُرانے دَور کی ادنیٰ جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ مزید برآں سیاسی اور معاشی کشمکش اور ہنگامہ خیز انقلابات کے بعد جو نئی سوسائٹی نمودار ہوتی ہے، وہ بسا اوقات اپنی پیش رَو سے پست اور گری ہوئی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے مارکس کا یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ "متضاد عناصر کی کشمکش کے بعد سوسائٹی کی جو نئی وضع ظہور میں آتی ہے، اس میں پچھلی سوسائٹی کے قیمتی اقدار (Values) محفوظ رہتے ہیں، اور سوسائٹی کی نئی وضع پُرانی وضع سے بلند اور اعلیٰ قدروں کی مالک ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر رومی سلطنت (Roman Empire) کے زوال کو لیجیے۔ بربریوں کے ہاتھ اس کے زوال نے ایسی سوسائٹی نہیں پیدا کی، جس کا معاشی نظام پہلے سے بلند اور بہتر ہو۔ اسی طرح اندلس سے عربوں کے اخراج کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ عربوں کی جلاوطنی کے بعد (۸۹۳ھ اور اس کے بعد، پندرھویں صدی عیسوی) اسپین (اندلس) پر ایسا زوال آیا کہ آج تک وہ نہیں پنپ سکا۔ اور کوئی ہٹ دھرم سے ہٹ دھرم انسان بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ عربوں کی جلاوطنی کے بعد اسپین کا معاشی نظام پہلے سے بہتر ہو گیا تھا، یا وہاں کی سوسائٹی ترقی یافتہ ہو گئی تھی۔

اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ مارکس کی پیشین گوئی اور جدلی اصول کے مطابق موجودہ سرمایہ داری نظام کے بعد "اشتمالیت" (Communism) ہی کا دَور دورہ ہو؟ حقیقت یہ ہے کہ اس ناپاک نظام کے کڑوے پھل مسلسل عالم گیر لڑائیوں کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ اور اگر ایک دو لڑائیاں اور اسی پیمانے پر مستقبل قریب میں پیش آئیں (جس کے قوی امکانات موجود ہیں)، تو تمدن اور شہریت کا یہ سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا، اور انسانی تاریخ کے ارتقاء کی آنے والی منزل "بربریت" کی ہو گی، نہ کہ اشتمالیت کی۔ مارکسی اشتراکیت کے

نقیب اور علم بردار سوویٹ روس کی موجودہ حکمت عملی بھی اس خیال کی تائید کرتی ہے "آمریت" کے عارضی انتقالی (Transitional) دور سے مثالی سوسائٹی Classless society کی طرف قدم بڑھانے کے بدلے وہ سرمایہ داری اور سامراج (Imperialism) کی طرف جھک رہی ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے۔

اور فرض کر لیجئے کہ مارکس کا کہنا صحیح ہوا، اور موجودہ سرمایہ داری نظام کے زوال کے بعد "اشتمالیت" نمودار ہوئی اور مثالی سوسائٹی کا آفتاب جلوہ فگن ہو گیا، تو اس کے بعد کیا ہو گا؟ تاریخ تو اپنی جدلی فطرت کی وجہ سے ایک مسلسل تبدیلی کا نام ہے۔ پھر انسانی سوسائٹی سکون کے ساتھ کس طرح بیٹھ سکتی ہے؟ اشتمالی سوسائٹی طبقاتی تصادم سے محروم ہو گی، تو وہاں تبدیلی کا محرک کہاں سے آئے گا؟ اور تاریخ کا جدلی ارتقا کس طرح ظہور پذیر ہو گا؟ جیسا کہ ہم کچھ اوپر بیان کر چکے ہیں، مارکس کی کتابیں ان سوالوں کا تشفی بخش جواب نہیں دیتیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مارکس کا یہ ہتھیار اشتمالیت سے پیش تر ادوار پر تو کام کرتا ہے، مگر بعد کے ادوار پر یہ "الٹی دھار" کی تلوار کام نہیں کرتی۔

اس سلسلے میں مارکس کا ایک خیال صاف طور پر غلط معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "انسان کا شعور زندگی کی وضع کی تعیین و تشکیل نہیں کرتا، بلکہ یہ زندگی کی سماجی وضعیں اور شکلیں ہیں جو انسانی شعور کی تعیین و تشکیل کرتی ہیں"۔ ہم یہ تو مان سکتے ہیں کہ معاشی عوامل ہماری سیاسی اور فکری زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، آخر معاشی ضروریات ہماری زندگی کا اوڑھنا بچھونا بھی تو ہیں۔ لیکن مارکس معاشی عوامل کی صرف اہمیت نہیں جتاتا۔ وہ معاشی عامل کی قطعیت (Finality) اور فیصلہ کن حیثیت اور اس بات پر زور دینا چاہتا ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبوں پر یہ حاوی اور اس کا اثر ہمہ گیر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ معاشی

سرگرمی اور سماجی نظام انسان کی ذہانت، افکار اور احساسات سے نہیں پیدا ہوتے، بلکہ ہمارے افکار و احساسات معاشی سرگرمی اور اس کے پیدا کردہ سماجی نظام سے پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہر پیداواری عامل (Productive force) اپنے انکشاف اور صحیح استعمال میں انسانی ذہانت کا محتاج اور دست نگر ہے۔ یہ عوامل فطرت میں پوشیدہ اور بالقوہ (Latent) موجود تھیں۔ یہ انسانی دماغ اور اس کا تعمیری تخیل تھا، جس نے ان سے کام لیا اور کام بنایا۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اشتمالی نظریہ کی سب سے بڑی گمراہی زندگی میں معاشیات کو اتنا درخور عطا کرنا ہے جس کے واقعات اور تجربوں سے تائید نہیں ہوتی۔ اور اس باب میں یہ اتنا ہی قابل مذمت ہے جتنا انسانی دماغ کا پیدا کردہ کوئی اور نظریہ۔ انسانی دماغ کے تخیل اور تراشے ہوئے نظریوں کی سب سے بڑی خرابی اُن کی انتہا پسندی اور ایک رُخی ہے۔ ایک مخصوص دور اور ایک مخصوص طرز حکومت و معیشت کے ستائے اور دبائے ہوئے انسان اُس دور اور نظام کی ہر چیز کو، خواہ مفید ہی کیوں نہ ہو، دور پھینک دینا چاہتے ہیں، اور انھیں اپنی نجات و فلاح اس کی مقابل سمتوں اور مخالف راہوں میں نظر آتی ہے۔ یہ انسانی عقل و دماغ کی فطری کمزوری ہے۔ اس کے ساتھ خواہشات و جذبات کا مرض برابر لگا رہتا ہے۔ جہاں تک سرمایہ داری کی مذمت اور تردید کا تعلق ہے، مارکس اس میں ایک حد تک حق بجانب تھا لیکن یہ صرف ایک رُخ اور ایک پہلو کی ترجمانی تھی۔ مگر اس کا علاج یہ تو نہیں کہ دوسری انتہا پر جا کر دم لیا جائے۔ امن اور سکون تو اعتدال اور بیچ کی راہ میں ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے قرآن کریم توسط و اعتدال کی شاہراہ (سواء السبیل) کہہ کر پکارتا ہے:

فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ (ترجمہ) "مگر اس کے بعد جس نے
(المائدہ: ۱۲)

تم میں سے کفر کی روش اختیار کی، تو درحقیقت اس نے "سواء السبیل" یعنی "عدل و توسط کی شاہ راہ" گم کردی"۔

"سواء السبیل" میں بڑی معنویت ہے۔ ترجمہ میں وہ ہمہ گیری نہیں سما سکتی۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ انسان کے اندر بے شمار قوتیں ہیں، خواہشیں ہیں، اور مختلف جذبات و رجحانات ہیں۔ پھر انسان کی اجتماعی زندگی بے حد و حساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہے۔ اور تمدن و تہذیب کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ پھر دنیا کے پھیلے ہوئے سامان زندگی اور انسانی تمدن میں ان کے استعمال کرنے کے سوال پر بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بہ کثرت شاخ در شاخ مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان اپنی فطری اور پیدائشی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصۂ حیات پر بیک وقت متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس لئے وہ اپنے لئے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری ضرورتوں کے ساتھ انصاف ہو، اور اس کی تمام خواہشوں اور قوتوں کا ٹھیک ٹھیک حق بھی ادا ہو جائے، اور اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام مسئلوں کی مناسب رعایت ملحوظ ہو، اور ان کی تمام مشکلات اور گتھیوں کا مناسب حل بھی نکل آئے، اور مادی اشیاء کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل و انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے ——— یہ ایک حقیقت ہے کہ جب انسان خود اپنا شارع اور رہنما بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو پر اس کی نظر جم جاتی ہے۔ حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر کچھ اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ وہ دانستہ یا نادانستہ زندگی کی دوسری ضرورتوں اور مشکلات سے بے انصافی کرنے لگتا ہے۔ اور جب وہ اپنی یک طرفہ رائے پر اصرار اور زندگی میں اُسے نافذ

کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو لامحالہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے، اور اس میں ایسی ٹیڑھ پیدا ہو جاتی ہے کہ کمزور فطرت اور جذبات سے مغلوب انسان اس کی ضدیں ایک دوسری سمت میں، ایک دوسری ٹیڑھ کی طرف جھکنے لگتا ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ جب یہ ٹیڑھی چال اپنی آخری حد پر پہنچ کر انسانیت کے لئے ناقابل برداشت ہوتی ہے، تو جن مسئلوں اور پہلوؤں کے ساتھ بے انصافی ہوئی تھی، وہ بغاوت کرتے ہیں، اور انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں، مگر انصاف کہاں؟ اس لئے کہ ضد میں پھر وہی بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے۔ جو پہلو پہلی ٹیڑھی چال میں زیادہ دبایا گیا تھا، وہ اب انسانی دماغ پر چھا جاتا ہے، اور جونئی راہ بنتی ہے، اور نیا حل تیار ہوتا ہے، اُس میں اُن مسئلوں کے ساتھ بے انصافی لگتی ہے؛ جنھیں پہلے بہت اُبھار دیا گیا تھا، اور ان کے ساتھ ضرورت سے زیادہ رعایت کی گئی تھی، اس طرح انسانی زندگی کبھی سیدھی راہ پر نہیں چلتی۔ وہ ہمیشہ ہچکولے کھاتی، اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی رہتی ہے۔ تمام راستے جنھیں انسان خود تجویز کرتا ہے، خطِ منحنی کی شکل میں واقع ہیں، غلط سمت سے چلتے ہیں، اور غلط سمت پر ختم ہو کر پھر کسی دوسری غلط سمت کی طرف مُڑ جاتے ہیں۔ ضرورت اعتدال کی راہ کی ہے۔ تباہی کی ان انتہاؤں کے درمیان نجات کی ایک درمیانی اور سیدھی راہ مطلوب ہے۔ ایک "طریق وسط" جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ انصاف کیا گیا ہو، تمدن ونظام معیشت کے تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کی رعایت ملحوظ ہو ـــــ اسی کو قرآن مجید "سواء السبیل" کہتا ہے۔ اور انسان اس کو معلوم کرنے پر قادر نہیں[ل] ۔ صرف

ل یہ سوال کہ "سواء السبیل" کے معلوم کرنے پر انسان کیوں قادر نہیں؟ اس کے تشفی بخش جواب کے لئے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا رسالہ "دین حق" پڑھئے۔ یہاں اس بحث کا موقع نہیں۔

اللہ تعالیٰ اس کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس قادرِ مطلق نے اپنے رسول اسی لئے بھیجے کہ وہ اس راہِ راست کی طرف مخلوقِ خدا کی رہنمائی کریں۔

مارکس کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی کہ اس نے "جدلی عمل" کو انسانی ارتقا کا فطری طریقہ سمجھ کر ایک انتہا پسندانہ پہلو پر زور دینا شروع کر دیا جس چیز کو وہ اثبات (Thesis) نفی (Antithesis) — یا ایک انتہا پسندانہ دعویٰ اور پھر اس کے جواب میں دوسرا انتہا پسندانہ دعوی — کہتا ہے، وہ دراصل بد نصیبی کے دھکّے ہیں، جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہو رہے ہیں، اور جن کی کارفرمائیوں کے باعث انسان تباہی کی دو کناروں کے درمیان لڑھکتا پھر رہا ہے۔ اگر ان بر خود غلط فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی، اور انھوں نے "سواء السبیل" کو دیکھ لیا ہوتا تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے لئے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی "سواء السبیل" ہے۔ نہ کہ ٹیڑھی راہ پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکّے کھاتا پھرنا[1]۔

خیر مارکس تو اس روشنی سے محروم رہا۔ اب اسلام کے باہمت داعیوں کے لئے موقع ہے کہ وہ مارکس کے گم کردہ راہ ماننے والوں تک اس روشنی کو پہنچا کر دم لیں۔

(۸)

مارکسی اشتراکیت کی تاریخ

(الف) روسی انقلاب سے پہلے:-

اشتراکیت اور مذہب پر مزید گفتگو سے پہلے مارکسی اشتراکیت کی تاریخ پر بھی ایک

[1] "سواء السبیل" کی یہ مفصل تشریح تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ مائدہ سے ماخوذ ہے (ترجمان القرآن: ج ۲۲ عدد ۶)۔

سرسری نظر ڈالنا ضروری ہے، تاکہ اشتراکی فلسفہ کے علم کے ساتھ ساتھ تاریخی سرگذشت بھی سامنے رہے۔

یوں تو مارکس اور اس کے رفیق اینجلز کا اشتراکیوں کی خفیہ جماعتوں سے عرصہ سے تعلق تھا، اور ان پر برابر اثر انداز ہو رہے تھے، تا آنکہ ۱۸۴۸ء؁ میں مارکس کا مرتب کیا ہوا اشتمالی منشور (Communist Manifesto) شائع ہوا، جو آج تک اشتمالیوں کا لائحۂ عمل بنا ہوا ہے۔ ۱۸۴۹ء؁ سے مارکس نے لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی، لیکن وہ اپنی تحریروں سے برابر مختلف ملکوں کے اشتراکیوں کو عمل اور جدوجہد کی دعوت دیتا رہا تا آنکہ مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن" قائم ہوئی، جو ان کی اصطلاح میں "پہلی بین الاقوامی" (First Internetional) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ انجمن بارہ برس قائم رہی۔ اس دوران میں اس نے بہت کچھ کام کیا، اور مختلف ملکوں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ اور اس طرح پر دنیا کے مزدور ایک رشتہ میں منسلک ہونے لگے یا ہو گئے۔

اس کی پہلی چار سالانہ کانفرنسیں (جنیوا ۱۸۶۶ء؁، لوزان ۱۸۶۷ء؁، برسلز ۱۸۶۸ء؁، بسل ۱۸۶۹ء؁) بہت کامیاب رہیں۔ مختلف کانفرنسوں میں اس کے اشتراکی رجحانات نمایاں ہونے لگے۔ شخصی ملکیت کی مخالفت کی تجویز بھی اس نے پاس کی۔ ۱۸۶۹ء؁ میں روسی انارکسٹ بکونن بھی اپنے خاص ہم نواؤں کے ساتھ اس میں شریک ہوا، اور یہی چیز آگے چل کر اس کی تباہی کا باعث ہوئی۔ ۱۸۷۲ء؁ میں مارکس اور بکونن کے اختلافات تیز ہو گئے،

۱؎ ۱۸۴۸ء؁ سے پہلے اشتراکی (سوشلسٹ) کہلاتے تھے۔ اینجلز کی روایت کے مطابق لفظ اشتمالی (کمیونسٹ) خاص کر اس لئے پسند کیا گیا کہ اُسے اس عہد کی رائج سوشلزم سے الگ کیا جا سکے۔

۲؎ اس کا پورا نام یہ ہے (International Workingmen Association)

اور بکونن انٹرنیشنل سے نکال دیا گیا۔ بکونن نے اپنی الگ 'بین الاقوامی' (انٹرنیشنل) قائم کی، جس کے ممبر اسپین اور اٹلی میں زیادہ تھے۔ اس اختلاف کے بعد پہلی بین الاقوامی کی صرف دو عام کانفرنسیں ہوئیں (۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۶ء) اس کے بعد یہ آپ اپنی موت مرگئی۔ بکونن اور مارکس کے فکری اختلاف پر پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس لئے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اس وقت مارکس زندہ تھا، اور 'پہلی بین الاقوامی' کی تمام سرگرمیوں میں اس کا عمل دخل رہا۔ اس کی حریف بکونن کی 'بین الاقوامی انجمن' کا حشر بھی کوئی زیادہ اچھا نہیں ہوا۔ البتہ اس کی تاریخ خونی صفحات سے بریز ہے۔ اس کا بنیادی پروگرام ہی اسٹیٹ (مملکت) کو بہ زور تباہ و برباد کرنا تھا، اس لئے خون خرابہ لازمی تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی حال میں یہ ۱۸۷۹ء تک زندہ رہی۔

۱۸۸۹ء میں دوسری بین الاقوامی (Second International) کے نام سے مشہور ہے، لیکن یہ دوسری بین الاقوامی کمزور تھی۔ مختلف شاخوں پر مرکز کا اثر بہت کم تھا۔ گو یہ بین الاقوامی برائے نام تھی، تاہم جنگِ عظیم تک اس کا وجود باقی رہا۔ جنگِ عظیم کے دوران میں مختلف ملکوں کے اشتراکی اپنے اصول سے منحرف ہو گئے[1]۔ کسی نے قومی وزارت قبول کی۔ کوئی قومی حکومتوں کی طرف سے لڑائی میں جی کھول کر شریک ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ

[1] ہم نے ابھی طبقاتی تصادم کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ وقت پر مزدور طبقے بھی طبقہ داری مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ پہلی بڑی لڑائی کے موقع پر تمام ملکوں کے اشتراکیوں نے اپنی اپنی قومی حکومتوں کا ساتھ دیا، اور سامراجی لڑائی کے لئے اپنی جانیں قربان کیں۔ حالانکہ جنگ کے آغاز کے بعد بھی بعض سوشلسٹ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ عام مزدور طبقہ لڑائی میں حصہ نہیں لے گا، بلکہ لڑائی کے ذمہ دار لیڈروں اور فتنہ پرداز سیاست کاروں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند

مزدوروں کی بین الاقوامی حیثیت عارضی طور پر ختم ہو گئی۔ یہ تو عملی دنیا کا حال تھا۔ جہاں تک اشتراکیت کی علمی تفسیر کا تعلق ہے، مارکس (ف ۱۸۸۳ء) کے بعد انجلز (ف ۱۸۹۵ء) اور اس کے بعد کارل کاٹسکی (Carl Kautsky) مارکسی اشتراکیت کا سب سے بڑا شارح اور مفسر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کی یہ حیثیت پہلی بڑی لڑائی کے آخر تک قائم رہی۔

۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد تحریک کی مرکزیت روس کو منتقل ہو گئی، اور وہیں مارچ ۱۹۱۹ء میں تیسری بین الاقوامی انجمن (Third International) کی داغ بیل ڈالی گئی، جو "کمیونسٹ انٹرنیشنل" کے نام سے بھی مشہور ہے، اور جو اپنے وجود کے آخری لمحہ تک دنیا بھر کے اشتمالیوں کی واحد قبلہ گاہ رہی۔ گو ایسے اشتراکی بھی دنیا کے مختلف حصوں میں بڑی تعداد میں موجود رہے، جو اپنے کو مارکس کا سچا پیرو سمجھتے ہوئے بھی تیسری بین الاقوامی سے اختلاف رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ ان ہی میں ہندوستان کی "کانگریس سوشلسٹ پارٹی" بھی شمار کی جاسکتی ہے۔ ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ روس کے اشتمالی مارکس کی اصلی تعلیم سے ہٹ گئے ہیں۔

"تیسری بین الاقوامی" سے اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۷ء کے بعد اشتراکیوں کی تین تین بین الاقوامیاں بیک وقت قائم تھیں۔

(الف) دایاں بازو، دوسری بین الاقوامی کا انتہائی صلح کل طبقہ (جینیوا)

(ب) مرکزی پارٹی جو وائنا میں قائم ہوئی اور جس میں متعدد ملکوں کی وہ مزدور جماعتیں شریک رہیں جو "دوسری یا تیسری بین الاقوامی" میں سے کسی کے ساتھ الحاق نہیں چاہتی تھیں۔

اس کا پورا نام: Workers International Union of the Socialist Parties ہے اور "وائنا انٹرنیشنل" کے نام سے بھی مشہور ہے۔

(ج) بایاں بازو، یعنی ماسکو کی کمیونسٹ انٹرنیشنل یا تھرڈ انٹرنیشنل۔ یہ اپنی ساخت اور پروگرام میں پہلی اور دوسری بین الاقوامی انجمنوں سے مختلف تھی۔ اشتمالیت 'پہلی بین الاقوامی' کو تو اچھی نگاہوں سے دیکھتی ہے، اس لئے کہ وہ مارکس اور اینجلز کی نگرانی اور سرپرستی میں کام کرتی تھی اور اس کی عملی پالیسی 'انقلاب' کی طرف رہنمائی کرتی تھی۔ 'دوسری بین الاقوامی' کی تعمیری اہمیت اشتمالیوں کے نزدیک اتنی ہے کہ اس نے مزدوروں کو ٹریڈ یونین اور دوسری سیاسی اور معاشی جماعتوں کے ذریعہ منظم کیا۔ اس سے زیادہ وہ اُسے اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں۔

(ب) روسی انقلاب اور اس کے بعد:

اشتمالیت (کمیونزم) یا مارکسی اشتراکیت کو بالشوزم (Bolshevism) بھی کہتے ہیں۔ یہ نام روس میں پڑا۔ روسی اشتراکیت مارکس کی تعلیمات کے عملی جامہ پہنانے کی کوشش ہے۔ یہ کوشش روسی انقلاب (۱۹۱۷ء) کے بعد برگ و بار لا سکی، لیکن اس انقلاب کے لئے زمین عرصہ دراز سے تیار کی جا رہی تھی۔

مارکس کی کتاب "سرمایہ" (Das Kapital) کا روسی ترجمہ ۱۸۷۲ء میں ہو چکا تھا اور اسی زمانہ میں روس کے اہلِ فکر، مزدوروں کے فلاح و بہبود کی طرف توجہ کرنے لگے تھے۔ ۱۸۹۸ء میں باضابطہ طور پر ایک پارٹی بھی بن گئی، جو زار کے انسانیت سوز مظالم کو مٹا کر اشتراکی نظام قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس پارٹی کا نام "جمہوری اشتراکی پارٹی" (Social Democratic Party) تھا۔ ابھی اس انجمن کے قیام کو زیادہ عرصہ بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ پارٹی کی دوسری کانگریس (منعقدہ برسلز ۱۹۰۳ء) میں آپس میں طریقِ کار پر سخت اختلاف ہوا اور پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک جماعت جو انقلاب اور خوں ریزی سے گھبراتی تھی، اقلیت میں تھی۔ اس لئے منشویک (Manshevic) یعنی اقلیت

کہلائی، اور دوسری جماعت جو انقلاب اور خوں ریزی کے حق میں تھی اور خالص مرکزی عسکری پارٹی کی حامی تھی، اکثریت میں تھی، اس لئے بالشویک (Bolshevik) یعنی اکثریت والی پارٹی کہلائی۔ دونوں پارٹیوں کے درمیان بنیادی اختلاف تنظیم کے سوال پر ہوا۔ اکثریت، جس کی قیادت لینن کے ہاتھ میں تھی، نظم و انضباط کے ساتھ سازشی کارروائیوں کی قائل تھی، جس میں پارٹی کا ہر فرد سرگرمی سے حصہ لے۔ اس کے خلاف اقلیت والی پارٹی کھلی تنظیم کی حامی تھی۔ ہر شخص جو پارٹی کے نصب العین سے متفق ہو، اُسے پارٹی کا ممبر بنانے میں عذر نہ ہونا چاہیے۔ یہ اُن کی رائے تھی۔ یہ اختلاف تو پہلے پہل ۱۹۰۳ء میں ظاہر ہوا۔ پھر طریق کار اور پالیسی میں مزید اختلاف بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں دونوں پارٹیاں باقاعدہ ایک دوسرے سے قطعی طور پر الگ ہو گئیں۔ یہ دوسری جماعت بہت جلد روسی مارکسیوں کی اکثریت کی نمائندہ ہو گئی۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب روس کے بعد یہی بالشویک پارٹی برسر اقتدار آئی۔ لینن Lenin آغاز سے اس جماعت کا لیڈر تھا اور اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک جماعت پر حاوی رہا۔ انقلاب کے بعد ٹراٹسکی (Trotsky) اس کا دست راست بن گیا اور ۱۹۲۴ء تک اس کی حیثیت لینن کے بعد دوسرے درجہ پر تسلیم کی جاتی تھی۔ لینن کی موت کے بعد اسٹالن (Stalin) حاوی ہو گیا۔ اس وقت یہ روس کی اشتراکی حکومت کا ڈکٹیٹر ہے۔

روسی انقلاب اور اس سلسلے میں انسانی جان و مال کی جو قربانیاں ہوئی ہیں ان کی تفصیل ہمارا موضوعِ سخن نہیں۔ صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہو گا کہ روس کے اشتراکی جہاں مارکس کی معاشی تعلیمات سے منحرف ہوتے ہیں، وہاں وہ تشدد کے بارے میں بھی اپنے پیشوا کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں۔

تیسری بین الاقوامی والوں (یعنی روسی اشتمالیوں) کا سارا زور تشدد پر ہے۔ وہ سرمایہ داروں اور ان کے معاشی نظام کی ہمیشہ مخالفت کریں گے۔ ان کی ساری زندگی اسی میں صرف ہوگی۔[1]

اس میں شک نہیں کہ مارکس کی تعلیمات کے مطابق بھی اشتراکیت کسی سماجی نظریہ کے ساتھ میل نہیں کھا سکتی، اس لئے مزدوروں کو طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور اس وقت تک مارکس کی شریعت میں ان کے لئے دم لینا جائز نہیں جب تک کہ وہ سرمایہ داری کی بنیاد کی آخری اینٹ نہ ہلا دیں۔

تیسری بین الاقوامی کی غلطی یہ ہے کہ وہ معاشی انقلاب سے زیادہ تشدد پر زور دیتی ہے گویا تشدد اپنی جگہ پر خود کوئی مقصد ہے۔ تیسری بین الاقوامی کہنے کو تو دنیا بھر کے مزدوروں کی انجمن تھی، لیکن روس کی اشتمالی پارٹی اس پر کچھ اس طرح حاوی[2] ہوگئی تھی، کہ کمیونسٹ (اشتمالی) پارٹی، اور تیسری بین الاقوامی دونوں ایک ہو کر رہ گئی تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ

---

[1] C O K ۶ ۷ صفحہ ۱۲۴۔ [2] لینن (ف ۱۹۲۴ء) زمانے میں تیسری بین الاقوامی ایک زندہ اور فعال قوت تھی۔ روس کے نظم و نسق کے سلسلے میں جو بھی پالیسی بنتی، کومنترن (تیسری بین الاقوامی) سے اس کے متعلق ضرور استصواب کیا جاتا۔ کومنترن میں ہر ملک اور ہر قوم کے اشتراکی شریک تھے اور یہ صحیح معنوں میں ایک بین الاقوامی جماعت تھی، لیکن اس میں روسیوں کا بہرحال غلبہ تھا۔ اسٹالن کی نئی قومی پالیسی شروع ہوئی، تو کومنترن کا زور بھی کم ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ اس کی عملی حیثیت ختم ہوگئی۔

تیسری بین الاقوامی کے ٹوٹنے[1] کا روس یا باہر کی سیاسیات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا ۔ بین الاقوامی تو معطل تھی ہی، اب اس کا اعتراف کر لیا گیا۔ ایک مشہور ہندوستانی[2] اخبار نویس کی زبان میں یہ ایک غیر قانونی اور غلط عمل درآمد (Defecto Phenomenon) کا باضابطہ اور قانونی (De jure) اعتراف ہے۔

بہر حال 'تیسری یا اشتمالی بین الاقوامی' کے بنیادی اصول یہ ہیں :

(الف) "اشتمالی بین الاقوامی تمام قوموں کی اشتمالی پارٹیوں کی انجمن ہے، اس لئے یہ انقلابی ہے" اس کا بڑا مقصد حالات و واقعات کو انقلاب کے لئے تیار کرنا ہے ۔ بورژوا[3] پارٹیوں کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ یا تعاون کرنا اس کے دائرہ عمل سے خارج ہے ۔

(ب) "اشتمالی بین الاقوامی" کی تنظیم ڈھیلی نہیں ۔ مرکز کا اقتدار شاخوں پر ہمہ گیر اور مستحکم ہے۔

---

[1] یہ بین الاقوامی پچھلی بڑی لڑائی کے دوران میں توڑ دی گئی (مئی ۱۹۴۳ء) اور تمام دنیا کی اشتمالی جماعتیں اپنی پالیسی اور طریقِ کار میں آزاد چھوڑ دی گئیں ۔ اس کا مقصود دراصل میں امریکہ اور دوسری جمہوری حکومتوں کو مطمئن کرنا تھا کہ اب روس دوسرے ملکوں کی اندرونی سیاست میں دخل انداز نہیں ہوتا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ صرف منافقانہ چال ہے ۔ ورنہ دنیا کی مختلف اشتمالی پارٹیوں کی رہنمائی اب بھی روس ہی کی اشتمالی پارٹی کرتی ہے ۔ بہرکیف اگر یہ اقدام دیانت داری کے ساتھ کیا گیا ہے تو اپنی پہلی حکمت عملی کی ناکامی کا اعتراف ہے۔ اور اگر نفاق سے کام لیا جا رہا ہے تو یہ اس تحریک اور اس کے چلانے والوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ۔ [2] توشر کانتی گھوش، ایڈیٹر امرت بازار پتر کا (کلکتہ) [3] اشتراکیت کی شریعت میں بورژوا کے معنیٰ ظالم" کے ہیں سرمایہ داروں، صنعتی ماہرین اور صنعتی اداروں کے منتظم اور بڑے کارندے جن کی خوش حالی اور ترقی سرمایہ داری نظام سے وابستہ ہوتی ہے، ان سب گروہوں کو مجموعی حیثیت سے مارکس بورژوا کا لقب دیتا ہے ۔

مرکزی ادارہ صرف پالیسی ہی متعین نہیں کرتا، بلکہ یہ جزئی تفصیلات بھی طے کر کے بھیجتا ہے۔ بین الاقوامی مرکزی ادارہ روسی حکومت اور اس کے ارباب اقتدار سے بے شبہ ذاتی اور سیاسی تعلق رکھتا ہے"[1] ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ لینن (ف ۱۹۲۴ء) کے بعد بین الاقوامی روسی حکومت کا دُم چھلا بن کر رہ گئی تھی۔ اور اسی بنا پر اس کے ٹوٹنے پر کہنے والوں نے کہا کہ ایک مردہ لاش کی باضابطہ تجہیز و تکفین سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں۔

(ج) مختلف اشتمالی پارٹیاں ایک عام وحدت اور مشترک پالیسی کے باوجود، روسی طرز پر منظم نہیں ہوتی ہیں۔ مغربی یورپ کی کچھ پارٹیاں کھل کر (Openly) کام کرتی ہیں۔ بعض ملکوں میں ان کی تنظیم اور سرگرمیوں پر پابندیاں عائد ہیں۔ کہیں اُن کی تشکیل بالکل خلافِ قانون ہے۔

(د) داخلی پالیسی میں ہر مقامی پارٹی بین الاقوامی کے زیرِ اثر رہی ہے، مگر مختلف قوموں کی پارٹیوں کے درمیان اندرونی معاملات میں پھر بھی خاصا اختلاف موجود ہے۔ جن ملکوں میں دستوری اور پارلیمانی مجلسوں کا چلن ہے وہاں اشتمالی پارٹیوں نے اپنے جوڑ توڑ اور عملی کارکردگی کے طریقوں میں خاصی ترمیم کر لی ہے۔ کبھی یہ لوگ پارلیمنٹ اور قانون ساز مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں، کبھی دوسری اشتراکی (سوشلسٹ) پارٹیوں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں[1] ـــــ لیکن یہ کوئی مستقل پالیسی نہیں۔ اس جوڑ توڑ میں حالات کے مطابق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ جن لوگوں نے ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے، وہ ان کی نت نئی تبدیلیوں اور جوڑ توڑ سے واقف ہیں۔ پہلے یہ کانگریس کو ایک بورژوا اور سرمایہ دار ادارہ سمجھ کر اس کے بائیکاٹ کے قائل تھے۔ پھر اس میں شرکت کی تاکید کی اور بڑی تعداد میں کانگریسی بننے کی کوشش کی، تا آنکہ خود کانگریس نے اُن کو نکال باہر کیا۔ اسی طرح یہ سوشلسٹوں کے ساتھ مل گئے تھے، اور متحدہ

---

[1] مقالہ "انٹرنیشنل" (برٹانیکا: ج ۱۲، ص ۵۱۳)

محاذ کی تشکیل ہوئی۔ کچھ دنوں بعد دونوں میں ان بن ہوگئی اور ایک دوسرے کے دشمن ہوگئے اس وقت طلبہ، مزدوروں، کسانوں اور سیاسی سرگرمیوں کے مختلف میدانوں میں دونوں پارٹیوں (کمیونسٹ اور سوشلسٹ) میں سخت رسہ کشی ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں کمیونسٹ (اشتمالی) پارٹی کے نمائندے پی، سی، جوشی۔ سجاد ظہیر۔ زین العابدین احمد وغیرہ اور سوشلسٹ (اشتراکی پارٹی) پارٹی کے نقیب جے پرکاش نرائن، رام منوہر لوہیا، یوسف مہر علی — اور ارونا آصف علی وغیرہ ہیں۔ پاکستان میں ان پارٹیوں کے ہواخواہوں کو کھل کر آنے کی جرأت نہیں ہو رہی ہے۔ مگر پس پردہ سرگرمیاں زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں۔

جنگ کے بعد سنہ ۱۹۴۵ء

ہم نے جان بوجھ کر روس کے اندرونی نظم و نسق سے اس لئے تفصیلی بحث نہیں کی کہ ہمارے موضوعِ سخن سے براہِ راست اس کا تعلق نہیں۔ البتہ ایک حقیقت کی طرف یہاں اشارہ کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ تو آپ اوپر پڑھ چکے ہیں کہ روسیوں نے پچھلی بڑی لڑائی کے دوران میں دسمبر ۱۹۴۳ء سرمایہ دار ملکوں کو خوش کرنے کے لئے "تیسری بین الاقوامی" کا باضابطہ خاتمہ کر دیا اور دنیا کے مختلف ملکوں کی اشتمالی جماعتیں اپنی پالیسی اور طریقِ کار میں آزاد چھوڑ دی گئیں۔ یہ تو کاغذی اعلان تھا۔ مگر مشرقی یورپ میں لڑائی کے بعد جو واقعات ظاہر ہوئے اور ان ملکوں کے نظامِ حکومت میں جو تبدیلیاں عمل میں آئیں، وہ ہوا کا رُخ کچھ اور بتاتی ہیں۔

ان ملکوں میں اشتمالی پارٹیاں تو لڑائی سے پہلے بھی تھیں، مگر دبی ہوئی۔ کہیں کہیں خلافِ قانون بھی تھیں، مگر روس کا جھنڈا بلند ہوتے ہی ان پارٹیوں نے سر اٹھایا اور کہیں پارٹیوں کے دباؤ، کہیں مختلف پارٹیوں کے تعاون، کہیں سوویٹ روس کے اقتدار کے زیرِ اثر روسی نظام کے نمونے پر حکومتیں بننے لگیں اور ٹھیک اسی طریقے پر اپنا کاروبار چلانے لگیں، جس طریقے پر

شروع شروع سویٹ روس نے اپنا نظامِ حکومت چلایا تھا۔ اسٹیٹسمین کے ایک مضمون نگار کی رائے میں، اُس وقت مشرقی یورپ سیاسی اور اقتصادی لحاظ سے سویٹ روس کی نئی اقتصادی پالیسی (N.E.P) والے دور (۱۹۲۱ء۔۱۹۲۵ء) کے مشابہ ہے، جب کہ وہاں تجارت اور زراعت میں ذاتی ملکیت کی گنجائش موجود تھی۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے اور اس کے لئے قرینہ موجود ہے کہ دوسری منزل سامنے ہے[۱]" اور یہی وجہ ہے کہ جن ملکوں میں اس طریقِ کار کی معمولی خلاف ورزی کا بھی شبہ ہوتا ہے، اس کے خلاف فوراً تادیبی کارروائی کی جاتی ہے۔

مشرقی یورپ کے اس اشتمالی نظام کو زیادہ منظم اور مضبوط بنانے کے لئے انھوں نے 'بین الاقوامی' کے طرز پر اور ان ہی مقاصد کے لئے ایک انجمن کو منفورم (Cominform)[۲] کے نام سے بنائی گئی ہے۔ اسے آپ کم سے کم مشرقی یورپ کے لئے 'اشتمالی بین الاقوامی' کا جانشین کہہ سکتے ہیں۔ اس کا پہلا وار یوگوسلاویہ کی مرکزی پارٹی پر ہوا ہے۔ اور اسی لئے مارشل ٹیٹو خاص طور پر ماسکو ریڈیو کا ہدفِ ملامت بنا ہوا ہے۔ ابھی ابھی ٹیٹو نے بھی ایک عام تقریر میں روس پر سخت تنقید کی ہے اور روسی ریڈیو پر "زہر پھیلانے" کا الزام عائد کیا ہے[۳]۔

---

[۱] مشرقی یورپ کی اشتمالی پارٹیوں پر ایک نہایت جامع مضمون (Communism in Europe) اسٹیٹسمین کی تین اشاعتوں میں شائع ہوا ہے (۱۴، ۱۵، ۱۶ جون ۱۹۴۸ء)

[۲] (Cominform) کی اصل غرض یہ بیان کی گئی تھی کہ یہ ایک انفارمیشن بیورو قسم کی ایک چیز ہوگی۔ مگر بہت جلد ہی اس سے مختلف اشتمالی پارٹیوں کی نگرانی اور ضبط و نظم قائم رکھنے کا کام لیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا اصل مقصد نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔

[۳] اسٹیٹسمین، مورخہ ۲۴ رجنوری ۱۹۴۹ء۔

خلاصہ یہ ہے کہ تیسری بین الاقوامی کے ختم کردینے کے بعد روس اپنے کام سے غافل نہیں۔ اور مشرقی یورپ ہی نہیں، چین سے لے کر ملایا، برما، بلکہ آسام، مشرقی بنگال، جنوبی ہند میں اس کے ایجنٹ اپنا کام کر رہے ہیں۔ اور لوئی فیشر کے الفاظ ہیں:

"اب مشرقی یورپ کی اشتمالی پارٹیوں کو انتہا پسند (Left) یا انقلاب پسند (Red) کہنا صحیح نہیں۔ اب وہ محض سلاوی نسل پرستی، اتحاد سلاوی اور روسی امپیریلزم کی حامی اور مددگار ہیں۔[۱]

(۹)

مذہب اور اشتراکیت

"اشتراکیت اور لامذہبیت" کے لزوم کے متعلق اوپر جو کچھ کہا گیا ہے، اس کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے اشتراکیت کے مادی فلسفہ اور لامذہبیت میں لزوم ہو، لیکن اشتراکیوں کا رویہ مذہب کے ساتھ مخالفانہ نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ وہ مذہب اور مذہبیات کی طرف سے لاپروا (Indifferent) ہیں۔

لیکن افسوس کہ واقعہ یہ نہیں۔ اشتراکیوں کو مذہب سے بیر ہے اور جہاں کہیں انھیں موقع مل سکا ہے، اس کی بیخ کنی میں انھوں نے اپنی سی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ایک مستند غیر مسلم مبصر کی کتاب کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی:

"ظاہر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشتمالیوں کو صرف معاشی معاملات سے دلچسپی ہے، لیکن معاشی اور دوسری اہم مصلحتوں کی وجہ سے وہ شہریوں کی تمدنی اور ذہنی زندگی سے پوری

۱۔ صفحہ ۳۵۸

دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ مذہب پر بھی پوری نگاہ رکھتے ہیں، اس لئے کہ اُن کی سمجھ کے مطابق
اشتمالیت مذہب کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ وہ اُسے اپنے پروگرام کی راہ میں ایک رکاوٹ
(Obstacle) خیال کرتے ہیں۔ اپنے طور پر تو وہ تمام مذاہب کے ترک کا عہد
کرہی چکے ہیں، وہ دوسروں کے مذہبی عقائد کا بھی قلع قمع کر دینا چاہتے ہیں۔ اشتمالیت کے
ارکان دہریت کی قسم کھا بیٹھے ہیں۔" (Recent Political Thought)

از Coker (ص ۱۶۱ ملخص)

"اشتمالی ارباب اقتدار مذہب کے کُھلے دشمن ہیں۔ حکومت اسکولوں میں مذہبی تعلیم کی اجازت
نہیں دیتی۔ مذہبی مطبوعات کی اشاعت پر پابندیاں عائد کر دی ہیں۔۔۔۔۔۔ اخباروں، رسالوں
عام جلسوں، اور متحرک تصویروں کے ذریعہ مذہب کے خلاف پروپگنڈے کی حوصلہ افزائی
کرتی ہے۔" (ص ۱۷۹)

اس "لامذہبیت" کے ساتھ ساتھ روس کے اشتراکی جس طرح سے لینن کے بُت پر
عقیدت واحترام کے پُھول نچھاور کرتے ہیں، اس سے کچھ خوش فہموں کو یہ وہم ہوا کہ شاید
اس طرح پر ان میں مذہبیت آرہی ہے۔ اس خوش فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے بھی امریکی مصنف
لکھتا ہے:۔

"بعض نقادوں کے خیال میں روسی اشتمالیت اپنے ان تمام لامذہبی اعترافات اور اعمال کے
باوجود ایک طور پر اپنے موجودہ طرزِ عمل سے مذہبی ہوتی جارہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں
سرکاری اور قومی دونوں طریقوں پر لینن کی پرستش (Apothesis) ہورہی ہے۔
سینکڑوں اس کی قبر کی روزانہ زیارت کرتے ہیں۔ اس کے مجسمے عام جگہوں میں نصب کیے جاتے
ہیں۔ اس کی تصویر کارخانوں میں خاص احترام کی جگہ رکھی جاتی ہے۔ سڑکیں، ریلوے اسٹیشن،

اور ہر قسم کی انجمنیں اس کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ (ص ۷۹)

اشتمالیوں کے یہ طریقے اور سرگرمیاں، بہر حال ان کی دہریت (Atheism) کے خلاف نہیں، الا یہ کہ کسی بعید مقصد کے لئے قربانیوں اور فدا کارانہ جنون طرازیوں کو مذہبی ہیچ اور اقدام کے مرادف قرار دیا جائے۔ اشتمالی ہمیشہ ان ہی مقاصد کے لئے کام کرتے ہیں، جو اسی دنیا میں حاصل کئے جا سکیں۔ کسی فوق البشری طاقت کے مکمل انکار کا جذبہ ایسا ہے جس کی بنا پر اشتمالی خاص طور پر مذہب کے مخالف کہے جا سکتے ہیں" (ص ۸۱)

عام اشتمالیوں کی مذہب سے مخالفت کی توجیہ و تحلیل، یہ امریکی مبصر اس طرح کرتا ہے:۔

"اشتراکیوں کے خیال میں مذہب عام طور پر انسان کو قسمت پر قناعت اور موجودہ طاقتوں کی اطاعت کی تعلیم دیتا ہے، یا پھر ان دنیاوی مشکلوں کی محض سلبی مقاومت کی تائید کرتا ہے۔ اس لئے، جیسا کہ مارکس کہہ چکا ہے۔ مذہب مخلوق کے لئے افیون ہے، جو ان کی بے چینی کو مختلف طریقوں سے دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ یا تو وہ مظلوم کے دفعیہ کے لئے کسی غیبی طاقت سے اپیل کرنے کی تعلیم دیتا ہے یا پھر وہ مصیبت زدوں کو متصوفانہ تعلیم کے ذریعہ قناعت حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اشتمالی یہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں کہ مظلوموں کو ان توہم پرستیوں میں نہ پڑنے دیں[1]" (ص ۸۱ ملخص)

---

[1] یہ ذہن نشین رہے کہ دراصل یہ باتیں تو اشتراکی، مذہب کی مخالفت کے لئے بہانے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ ان کی مخالفت مذہب کا اصل سبب یہ ہے کہ مذہب لازماً ایک اخلاقی ضابطہ کی پابندی پر زور دیتا ہے اور معاشرہ میں انسانوں کے کچھ حقوق متعین کرتا ہے، جس پر دست درازی وہ کسی حال میں جائز نہیں رکھتا۔ بخلاف اس کے اشتراکی اپنے نظام معیشت و تمدن کو قائم کرنے کی سعی میں کسی اخلاقی بندش کو توڑنے اور کسی حق کو پامال کرنے میں تامل نہیں کرتے (باقی ص ۶۶ پر)

اس امریکی مبصر نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اپنے مطالعہ اور وسعتِ نظر کی مدد سے، اب آئیے ایک دوسرے مشہور امریکی اہل قلم لوئی فیشر کے چشم دید تاثرات بھی ملاحظہ کر لیجئے:۔

"بالشویک، مذہب کے دشمن اور کلیسا کے مخالف ہیں۔ روس کے مذہبی لیڈر یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بالشوزم ہی ——— اُن کے لئے کوئی بھلائی نہیں۔ بالشویک تمام مذہبوں کو ایک خلافِ عقل اور بے وقت کی چیز شمار کرتے ہیں۔ اُن کے نصب العین کی ایک تصویری تمثیل یوں دیکھنے میں آئی کہ ایک تومند مزدور ہاتھ میں ہتھوڑا لئے گرجوں، دیروں، اور مسجدوں کو منہدم کر کے آسمان کا رُخ کئے ہوئے ایک زینے پر چڑھ رہا ہے اور وہاں ایک سیاہ آتشیں چہرہ اس مزدور کو آتا ہوا دیکھ کر سہما جا رہا ہے۔"[۱]

سوویٹ علاقے میں بیسیوں مذہبی ادارے بند ہو چکے ہیں، بہتیرے اب بھی باقی ہیں۔ سرکاری طور پر مذہبی عبادت کی اجازت ہے، مگر اس کی ادائی میں سخت سماجی دشواریاں ہیں۔ دو مشہور اشتمالیوں نے اپنی مشہور کتاب "اشتمالیت کی ابجد"[۲] میں صاف طور پر لکھا ہے کہ عوام کی مذہبی رجعت پسندی کے خلاف مہم نہایت

(بقیہ ص ۶۵) مزید براں اشتراکیوں کی نگاہ میں مذہب اس معاشی و سماجی نظام کا پیداوار تھا اور اس کی پشت پناہ کا کام دے رہا تھا، جسے وہ مٹانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس نظام کے ساتھ مذہب کو بھی مٹ جانا چاہئے۔ اب سماج میں اگر کوئی مذہب برقرار رہ سکتا ہے تو وہ صرف وہی ہے جو اشتراکی نظام سے موافقت کرے، جسے اشتراکی نظام حق کہے، اُسے مذہب بھی حق کہے، اور جسے وہ باطل کہے اُسے مذہب بھی باطل قرار دے۔ ظاہر ہے کہ کوئی مذہب یہ پوزیشن قبول نہیں کر سکتا، اس لئے مذہب سے اشتراکیوں کی لڑائی ہے۔

۱؎ (Lenin's Russia) ص ۲۹-۲۸ ؎۲ (A. B. C. of Communism)

صبر اور سوجھ بوجھ کے ساتھ چلانا چاہیئے - ہر بات پر ایمان لانے والے بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں ...... مسخرہ پن اور استہزاء سے مذہب شکن مہم کو نقصان پہنچ جائے گا۔

بائیں ہمہ صبر پر استہزاء کا غلبہ رہا اور ہر مذہبی تقریب کے موقع پر مخالفوں کی طرف سے مسخرہ پن کی نمائش ضرور ہوتی ہے۔" (ص ۲۹)

یہی امریکی اہل قلم کرسمس ڈے ۱۹۲۳ء کے ایک جلوس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:۔

"میں نے دیکھا کہ نوجوان اشتمالی مذہبی آیتوں (Church hymns) کو بگاڑ بگاڑ کر ماسکو کی سڑکوں پر گاتے پھرتے ہیں - ایک نوجوان اشتمالی ایک گاڑی پر کھڑا چیخ رہا تھا خدا (ودا) کوئی چیز نہیں - اور اگر ہے تو مجھے سزا کیوں نہیں دیتا؟ جس جس راستہ سے وہ گذرتا، عورتیں اس کے احترام (!!) میں صلیب کا نشان بناتیں ...... شام کو تمام مذہبوں کے خداؤں کے فرضی تابوت ریلوے اسٹیشن کے قریب نذر آتش کئے گئے۔ (ایک طرف یہ ہولی کھیلی جا رہی تھی) اور دوسری طرف مختلف جوڑے رقص و سرود میں مصروف تھے۔" (ص ۳۰)

لہ تیسری بین الاقوامی کی چھٹی عالمگیر کانفرنس (۱۹۲۸ء) میں اسی نہج پر یہ پروگرام مرتب ہو کر پاس ہوا تھا۔

"مذہب (یعنی خلقت کی افیون) کے خلاف جہاد کرنا تہذیبی انقلاب کا اہم حصہ ہے، یہ مہم مسلسل اور مرتب طور پر جاری رکھنا چاہیئے۔" (viii (Religion

اس طرح اس سے بہت پہلے روس کی اشتمالی پارٹی کے پروگرام (مرتبہ ۱۹۱۹ء) از یر عنوان "عام سیاسی اور معاشی مسئلے" دفعہ ۱۳) میں بھی یہ ہدایت دی گئی تھی:۔

"ساتھ ساتھ ہمیں معتقدین کے جذبات کو گزند پہنچانے سے بچنا چاہیئے کہ اس سے مذہبی وحشت میں اور زیادتی ہوتی ہے۔"

اشتمالی روس اور اشتمالیوں کی مذہب دشمنی کا ایک معمولی نمونہ یہ ہے کہ روس کی اشتمالی پارٹی کی رکنیت کیلئے ہر قسم کے مذہبی خیالات سے "پاک" ہونا ضروری ہے۔ روس کے بڑے مداح مسٹر اور بیگم سڈنی وب (Sydney Webb) اپنی مشہور اور مشترک مبسوط کتاب میں رقمطراز ہیں:۔

"پارٹی ممبری کے لئے داخلہ کی درخواست کے ساتھ اس بات کا قطعی اقرار ہونا چاہئے کہ امیدوار صدق دل سے اشتمالی نصب العین کو اس شکل میں تسلیم کرتا ہے جو مارکس نے وضع کی، اور ان تعبیروں کے ساتھ جو لینن اور اسٹالن نے پیش کی ہیں، اور عیسائی یا کسی دوسرے مذہبی یا مابعد الطبیعی فکر سے ان کے مکمل بے تعلق ہونے کی قطعی تصدیق ہونا چاہئے کہ اس طرح کے مذہبی اور مابعد الطبیعی افکار (Ideologies) اور مارکسی اشتمالیت کے ساتھ کامل وابستگی کا کوئی میل نہیں۔[1]"

یہ حصہ طویل ہوتا جا رہا ہے، مگر ذرا ضبط سے کام لے کر اشتراکیت کے اقانیم ثلثہ (مارکس، اینجلز، لینن) کے ارشادات پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیجئے۔ مارکس کے فلسفے کی تشریح تو اوپر گذر چکی ہے۔ اینجلز اس کی صدائے بازگشت ہے۔ لینن بھی ان ہی دونوں کا پیرو ہے۔ مگر یہ پہلا شخص ہے جس نے اشتمالیت کو روس میں عملی جامہ پہنایا اور اس سلسلے میں مارکس کی تعلیم میں اس نے جزوی ترمیم بھی کی۔ اس حیثیت سے اس کی بڑی اہمیت ہے اور دنیا کا ہر اشتراکی اس کی پیروی کا دم بھرتا ہے[2]۔ حسن اتفاق سے اس وقت ہمارے سامنے لینن کے

[1] (Soviet Communism a new Civilization) مطبوعہ ۱۹۴۴ء (ص ۲۶۶)

[2] روس کے اس نئے مذہب (اشتمالیت یا اشتراکیت) کے معتقدات و معبودان باطل کی ایک صاحب نظر نے اس طرح توجیہ و تقسیم کی ہے:۔

(باقی ص ۶۹)

مضامین و خطبات کا ایک مجموعہ[1] ہے جس میں صرف مذہب سے متعلق اس کی تحریریں اور خطبے جمع کئے گئے ہیں اور ان خطبوں اور تحریروں میں ان تینوں کے اقوال اور نظریے آگئے ہیں اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس مجموعہ سے کچھ اقتباسات یہاں پیش کر دئے جائیں۔

"مذہب کی تنقید سب تنقیدوں کی جڑ ہے۔ (مارکس: صفہ)

"یورپ کی مزدور پارٹیوں میں دہریت ایک جانی بوجھی ہوئی حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے"

(اینجلز: ص[1])

"مارکسیت مادیت کا دوسرا نام ہے اور اس لئے یہ مذہب کی ویسی ہی سخت دشمن ہے جیسی اٹھارھویں صدی کی عام مادیت یا فیورباخ[2] کی مادیت تھی۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، لیکن مارکس اور اینجلز کی جدلی مادیت، فیورباخ اور اٹھارہویں صدی کے دوسرے مادہ پرستوں سے آگے جاتی ہے۔ یہ مادی فلسفہ کو تاریخ اور عمرانیات پر استعمال کرتی ہے۔ "مذہب کا قلع قمع کرنا" مادیت اور مارکسیت کی ابجد ہے۔ لیکن مارکسیت کی منزل یہیں ختم نہیں ہو جاتی، مارکسیت بہت آگے جاتی ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں صرف مذہب کے قلع قمع کرنے کی استعداد پیدا کرنا ہے۔ اور اس کے لئے

(بقیہ ص ۶۸) "مارکس خدا، لینن پیغمبر، (Das Kapital) الکتاب اور روٹی کلمہ۔

(نعیم صدیقی "ترجمان القرآن" ذی قعدہ و ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ)

اس میں اگر اینجلز کو روح القدس کی حیثیت دے دی جائے تو مارکس اور لینن کے درمیان اس کا مقام بھی متعین ہو جاتا ہے۔

[1] (Religion) از (V. I. Lenin) شائع کردہ برمن پبلشنگ ہاؤس، ہیرسن روڈ کلکتہ۔

[2] (Feurback) ۱۸۰۴ء۔ ۱۸۷۲ء ایک جرمن فلسفی جو پہلے ہیگل کا ہیرو تھا بعد کو مادہ پرست ہو گیا۔

مادی نقطۂ نظر سے اس بات کی تشریح کی ضرورت ہے کہ مذہب اور ایمان عوام میں کیوں رائج ہیں۔[1]

پرولتاری سوشلسٹ پارٹی کے لئے مذہب خانگی معاملہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہماری پارٹی طبقہ واری شعور رکھتی ہے اور مزدوروں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ ایسی جماعت مذہبی اعتقادات کی پیدا کردہ جہالت سے غفلت نہیں برت سکتی اور نہ اُسے غفلت برتنا چاہئے۔ مملکت سے کلیسا کی کامل علیحدگی کا مطالبہ ہم اسی لئے کرتے ہیں کہ خالص عقلی ہتھیاروں (صحافت، تبلیغ) سے کام لے کر مذہب کا ہوا دور کیا جاسکے۔ ہماری پارٹی کا ایک بنیادی مقصد مزدور کی مذہبی فریب خوردگی کا دُور کرنا بھی ہے۔[2]

(اینجلز، ص ۱۵)

"مذہب ان روحانی مصیبتوں کی ایک قسم ہے، جو دوسروں کے آرام کی خاطر محنت مزدوری کرنے والے فاقہ کش غریبوں پر چھائی رہتی ہے۔ مظلوم جب ظالم کے خلاف جدوجہد میں ناکامی کا مُنہ دیکھتا ہے، تو خواہ مخواہ اس کے دل و دماغ میں موت کے بعد ایک دوسری زندگی کا تخیل نشوونما پانے لگتا ہے۔ ...... مذہب ان تمام غریبوں

لہ (Lenin) (ص ۲۳)

کہ اسی مقصد کے پیشِ نظر روس میں مخالف الوہیت سوسائٹی (God less) کا قیام عمل میں آیا (۲۲ء)۔ اس کا مقصد اس کی زبان میں یہ تھا: "آسمانی زاروں (زار، روس کے بادشاہوں کا لقب تھا) کو ان کے عرش سے اتار پھینکنا، جس طرح اس دنیا کے زاروں کو نکال پھینکا ہے"۔ عبادت کی آزادی تو سب جماعتوں کو حاصل تھی، لیکن پروپگنڈا کا حق صرف اسی سوسائٹی کو حاصل تھا۔ ۱۹۳۲ء میں اس انجمن کے ممبروں کی تعداد پچاس لاکھ تک پہنچ گئی تھی (People's story of Soviet Russia by A R Williams) ص ۲۱۳۔

اور محنت کش طبقوں کو جو اس دنیا میں تکلیف کی زندگی بسر کرتے ہیں، قناعت اور صبر کی تعلیم دیتا ہے اور جنت میں انعام و اکرام کے وعدے دلا دلا کر ان کی تسکین و تسلّی کرنا چاہتا رہے وہ جو دوسروں کی محنت پر گل چھرے اڑاتے ہیں، تو انھیں یہ مذہب اور خیرات کی تلقین کرتا ہے۔ اس طرح پر ظلم و تعدی کے جواز کی ایک صورت نکل آتی ہے، اور ساتھ جنت کا سستا ٹکٹ بھی مل جاتا ہے۔" (ص ۱۲-۱۱)

"خوف نے خدا کو پیدا کیا۔ سرمایہ کی اندھی قوت کا خوف، اندھی اس لئے کہ اس کا عمل عوام کی نگاہوں سے مخفی ہے۔ ایسی قوت جو مزدوروں اور چھوٹے تاجروں کے لئے ہر قدم پر ناگہانی اور غیر متوقع تباہی کا سبب بن کر ان کے سروں پر گداگری، فاقہ کشی اور عصمت فروشی کی لعنت مسلط کر سکتی ہے ـــ یہ ہے موجودہ مذہب کی بنیاد، جسے ہر مادہ پرست کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اگر وہ مادہ پرستی کی ابجد سے آگے بڑھنا چاہتا ہے۔" (ص ۲۴)۔

یہ کہا جاتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ انقلاب روس کے دوران میں مذہب کی مخالفت کی وجہ کچھ اور تھی۔ ایک بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ چونکہ کلیسا اور اہل کلیسا انقلاب اور انقلابیوں کے سخت مخالف بلکہ زار کے آلۂ کار بن گئے تھے، اس لئے فطری طور پر انقلابی مذہب کے درپے آزار ہو گئے۔ مگر جن لوگوں کی نظر مارکس کے فلسفہ اور نظریوں پر ہے، وہ اُسے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ البتہ یہ کہا جائے کہ خود مارکس کا فلسفہ اپنے ماحول اور مخصوص حالات کی پیداوار ہے، تو اس کی گنجائش ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ چونکہ اٹھارہویں صدی کے آخر اور اُنیسویں صدی کے آغاز میں سرمایہ داروں اور اہل کلیسا کی ملی بھگت ہو گئی تھی، اور عیسائیت کی تحریف شدہ تعلیم نے اہل مذہب کو ظالموں اور جفاکار سرمایہ داروں کا مطیع اور فرماں بردار بلکہ آلۂ کار بنا دیا تھا، اس لئے مارکس نے پورے مذہب اور مذہبی نظام ہی کو ترقی اور انسانی

فلاح و بہبود کا دشمن سمجھ لیا۔ مگر اس میں غلطی کس کی ہے؟ مارکس کی یا مذہب کی؟ اسلام کے قانون اور نظامِ معاشرت و معیشت کے مطالعہ سے اسے کس نے منع کیا تھا؟ صرف ایک مُلک اور اس کے ایک محدود مذہبی نظام کو دیکھ کر پورے مذہب پر فتویٰ صادر کرنا کوئی عقلی اور منطقی طرزِ عمل تو نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر یہ غلطی مارکس سے ہو گئی تھی، تو اس کے ماننے والوں کو اسلام جیسے جامع اور ہمہ گیر دین کے مطالعہ سے کون روکتا ہے؟ مگر حقیقت یہ نہیں۔ یہ تو سادہ لوح مسلمانوں کے بہلانے کے کھلونے ہیں۔ دراصل ان اشتمالیوں اور اشتراکیوں کے دل و دماغ میں مارکس کا مادی نظریہ اور مادہ پرستی گھر کئے ہوئے ہے۔ اور جب دل و دماغ پر مادہ پرستی چھائی ہوئی ہو، تو پھر وہاں مذہب یا اخلاق او زندگی کی دوسری بلند اور صالح قدروں (Values) کا کیا ذکر؟

(۱۰)

اسلام اور اشتمالیت (Communism)

مذہب کے متعلق عام اشتراکیوں اور روسی اشتمالیوں کے رویہ پر تو روشنی ڈالی جا چکی، لیکن خاص اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہ کس طرح پیش آتے۔ اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ایک جہاں دیدہ مسلمان معاصر کے بیان کے مطابق:۔

"سوویٹ روس نے اسلام کے مقابلے میں دو رُخی پالیسی اختیار کی۔ باکو کانگریس[۱] (۱۹۲۰ء) کے فیصلے کے مطابق انھوں نے مشرقی دنیا میں اپنے کو مظلوموں کا ہمدرد اور غریبوں کا

---

[۱] باکو کانگریس کے لئے ملاحظہ ہو سٹاڈرڈ (Stoddard) کی،

"The Revolt against Civilisation" (ص۔، ۲۱۶)

نجات دہندہ مشہور کیا۔ مگر داخلی حکمت عملی اس کے خلاف تھی۔ اسٹالن کی تشریح،
(۱۹۳۰ء کی رپورٹ) اور سفاروو (Spharon) (کی توضیح (۱۹۲۲ء کی رپورٹ) کے
مطابق اس کا مقصد مذہبی اجتماعات کو ختم، تورانیت کی تحریک کو کمزور کرنا اور بڑی...
جائیدادوں کی ضبطی اور سب سے بڑھ کر مذہب اسلام کا قلع قمع کرنا تھا"

"گویا اشتمالیوں نے اسلام کے مقابلے میں دوہری پالیسی چلائی۔ باہر انھوں نے
اپنے کو مغربی سامراج کے مقابلے میں مظلوم اسلام کا ہمدرد مشہور کیا اور اپنے
ملک کے اندر انھوں نے اسلام کا نام لینے والوں پر سختیاں شروع کیں۔ اسی لئے
مخالف الوہیت تحریک' اسلام کو معاف نہیں کرتی۔ یہ تحریک سارے روسی علاقے
میں اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتی ہے۔ نیز انھوں نے حج کو قانوناً ممنوع قرار دیا۔ اسی طرح
دوسرے مسلمان ملکوں سے انھیں بالکل بے تعلق کر دیا گیا۔ بیت المقدس کی موتمر اسلامی
(۱۹۳۱ء) میں روسی مسلمانوں کے نمائندہ عیاض اسحاقی نے مسلمانان روس کی حالت ار
پر ایک رپورٹ پڑھی تھی۔ اسی طرح سعید شامل (صدر مجلس دفاعی ملی، قفقاز) نے
ایک دوسری رپورٹ پیش کی تھی، جس میں روس کے مسلم علاقوں میں مخالف الوہیت
تحریک کی سرگرمیوں اور مسلمانوں پر بے جا سختیوں کی تفصیل دی گئی تھی"

(اسلام ان دی ورلڈ، از ڈاکٹر زکی علی مصری، صفحہ ۳۵۵-۳۵۶)

اسلام کے ساتھ روس کی سویٹ حکومت کے برتاؤ کا سرسری اندازہ تو ڈاکٹر زکی علی مصری
کے اسی بیان سے ہو سکتا ہے، مگر ضرورت ہے کہ تفصیلی طور پر اس پالیسی کی تشریح کی جائے،

۱؎ نیز ملاحظہ ہو (طبع دوم مطبوعہ ۱۹۴۷ء، صفحہ ۳۵۰-۳۴۹)، روسی ایشیا میں جو مختلف جمہوریتیں قائم ہوئی
ہیں اور جو سویٹ روس کی مرکزی حکومت کے تابع ہیں، ان کا مختصر حال بھی ڈاکٹر زکی علی نے درج کیا ہے (صفحہ ۳۴۲-۳۴۰ طبع دوم)

جو مسلمانانِ روس کو اسلام سے الگ کرنے کے سلسلے میں اختیار کی گئی۔

یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے مذاہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ روسی حکومت کا برتاؤ شروع شروع اچھا رہا، مگر یہ اس لئے نہیں کہ انھیں اسلام سے کچھ ہمدردی تھی، وہ سمجھتے تھے، کہ ان "وحشیوں" پر تشدد کا ردِ فعل بُرا ہوگا۔

لوئی فیشر کی کتاب کا حوالہ اوپر بھی دیا گیا ہے؛ اس سلسلے میں وہ اپنے چشم دید تاثرات بیان کرتا ہوا لکھتا ہے :۔

"دو سال کے اندر مذہب شکن جلوس رُک گئے، گو اہلِ کلیسا پر سختی باقی رہی، اللہ کے ماننے والوں (یعنی مسلمانوں) کے ساتھ خاص طور پر روادارانہ برتاؤ کیا گیا، اس لئے کہ اربابِ اقتدار تشدد کے خطرناک فعل سے ڈرتے تھے۔"

اور اس ظاہری روادارانہ سلوک سے مسلمانانِ روس کی فریب خوردگی کی داستان بھی سُن لیجئے :۔

"اوفا (سائبیریا) میں تمام مسلمانانِ روس کی کانگریس منعقد کرنے کی اجازت دی گئی (اکتوبر ۱۹۲۳ء) اور کانگریس نے لینن کو مبارک باد کی تجویز پاس کرکے بھیجی، جو بالشویک اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ تجویز میں یہ پاس کیا گیا تھا کہ مسلمانان لینن کی صحت کے لئے اللہ سے دعا کرتے ہیں"

(لوئی فیشر کی" Lenin's Russia ص ۳۰)

اللہ رے سادگی!! شاید کسی ایسے ہی موقع پر اقبال نے کہا ہو :۔

سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اصل یہ ہے کہ روس کے مسلم علاقوں خاص کر ایشیائی روس میں اشتمالیوں نے لامذہبیت کی مہم بہت سُوجھ بُوجھ کے ساتھ اور سنبھل سنبھل کر چلائی؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس برس کے عرصے میں روس میں مسلمانوں کا ملی وجود حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ شاید راقم کا بیان روس کے پرستاروں

یا فریب خوردہ مسلمانوں کو حیرت انگیز معلوم ہو، اس لئے مناسب ہوگا کہ وہ چشم دید شاہد کی زبانی یہ دردناک کہانی سُنیں :-

مسٹر ایم، آر، مسانی جنھوں نے دو مرتبہ روس کی زیارت کی ہے، ۱۹۲۷ و ۱۹۳۶ء جمہوریہ آذربائیجان کے ایک ممتاز کمیونسٹ افسر سے اپنی گفتگو نقل کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :-

"میں نے دریافت کیا :-

"کامریڈ، اب کچھ اپنی مخالف الوہیت تحریک کے متعلق سُنائیے - میں خود بھی آزاد خیال (Rationalist) ہوں، اس لئے مجھے خاص طور پر دلچسپی ہے۔"

جواب ملا :-

"ہم نے روس کی طرح یہاں مذہب کے خلاف دھواں دھار تحریک نہیں چلائی سرمایہ داری کی طرح مذہب کو بیک جنبشِ قلم نہیں ختم کیا جاسکتا - ہماری پالیسی بہت محتاط رہی ہے - توہم پرستی کے خلاف سائنٹفک نقطۂ نگاہ پیدا کرنے کے لئے ہم نے زیادہ تر تعلیم پر اعتماد کیا - نتیجہ بہت حوصلہ افزا ہے - نوجوان بالکلیہ لامذہب ہیں، اور تو اور اجتماعی مزرعوں میں کام کرنے والا مسلمان کاشتکار بھی سمجھتا ہے کہ اب وہ دوسری دنیا میں آرام کی خاطر کچھ زیادہ کام کر کے مُلاؤں کو نذر دینے[۱] کی مصیبت سے بچ گیا ہے - میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ روسی حکمت عملی غلط تھی - وہاں لوگ تبدیلی کے لئے نسبتاً زیادہ تیار تھے اس لئے وہ زیادہ تیز جاسکے۔"[۲]

---

[۱] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایشیائی روس میں مذہب کے علمبرداروں کا کیا حال تھا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مُلا اور پیر، عوام کو نجات کی امید دلا دلا کر نذرانے خوب وصول کیا کرتے تھے۔

[۲] (Soviet Side lights) مصنفہ (M.R. Masani)
مع پیش لفظ از پنڈت جواہر لال نہرو (بمبئی: ۱۹۳۶ء)

سوجھ بوجھ اور احتیاط کی مہم کا خاکہ تو آپ نے دیکھ لیا۔ اب ذرا ضبط سے کام لے کر حوصلہ افزا نتیجہ کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔

جمہوریہ آذربائیجان کے صدر مقام باکو کے تاثرات قلم بند کرتے ہوئے مسٹر مسانی لکھتے ہیں :۔

"شہر ہی کے حدود میں ایک رقبہ "قدیم ترکی شہر" کے نام سے مشہور ہے.... اس قدیم مشرقی علاقے کی گلیوں کو نئے شہر سے کوئی نسبت ہی نہیں، جہاں تیل کے چشمے ہیں اور جہاں دکانوں کا ساز و سامان ماسکو کی دکانوں سے کسی طرح کم نہیں"[1]

پرانے شہر میں ایک مسجد بھی ہے، جس کے "ملا" سے میں نے باتیں کیں۔ اس نے کہا "تقریب قریب تیس چالیس مسلمان روزانہ یہاں نماز پڑھنے کو آتے ہیں"۔ اس نے گذری ہوئے دنوں کو یاد کیا، جب مسجد نمازیوں سے بھری رہا کرتی تھی۔ اب صرف بوڑھے اور وہ بھی کبھی کبھی آتے ہیں۔ یہ نمازی عام طور پر دیہاتی باشندے ہیں اور اپنے بیٹوں کے ساتھ شہر میں رہتے ہیں جو باکو میں مزدوری کرتے ہیں۔ رہے نوجوان تو ان کی دنیا ہی دوسری ہے اور وہ لائق الزام بھی نہیں، جب کہ کھیل، کتاب خانے، سیرگاہیں اور ٹریڈ یونین پارٹی کی طرف سے مطالعہ کے حلقے ـــــ بیسیوں چیزیں ان کی دلچسپی کے لئے موجود ہیں" (ص ۵۴)

اب ان ملا صاحب کی سادہ لوحی بھی ملاحظہ ہو :۔

"میں نے دریافت کیا کہ اس پنچائتی پرجا راج (U. S. S. R) کے دور میں جو نئی تبدیلیاں ہوئی ہیں، ان کے متعلق بڑے بوڑھوں کا کیا خیال ہے؟

---

[1] ص ۵۳، ملخص۔

جواب ملا۔ مختلف لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔ ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اس سے بہت کچھ فائدہ ہوا ہے، مگر میں پردہ اٹھانے کے حق میں نہیں۔ یہ قرآن کے احکام کی خلاف ورزی ہے۔" (ص ۱۰۱)

گویا "پردہ شکنی" سے زیادہ کوئی انوکھی اور نقصان رساں تبدیلی اس دور میں ہوئی ہی نہیں! اللہ رے سادہ لوحی اور بے خبری!! حالانکہ صورت حال اس سے بہت بدتر تھی اور خود مُلا صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ مسافی صاحب چٹخارے لے لے کر بیان فرماتے ہیں:۔

"بیچارے مُلا کی ساری زندگی اسی مسجد کی خدمت میں گذری ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر حسرت ناک پژمردگی چھاگئی کہ اب چند برسوں کے بعد اس مسجد میں کوئی آنے والا نہیں رہے گا اور یہ مقفل کردی جائے گی یا یہیں کوئی اسکول وغیرہ قائم کردیا جائے گا۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو کر رہے گا" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ یہ ایک مٹتے ہوئے نظام کی طرف سے شکست کا اعتراف تھا۔

یہ ایک زوال پذیر نظام تھا، ایسا زوال پذیر نظام جو اشتمالی انقلاب تک باقی رہا۔ ایسا سماجی نظام جس میں باکو کے ترک مزدور جہالت اور توہم پرستی میں گھرے ہوئے قلیوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے اور ترک عورتیں پردہ کے اندر قیدیوں اور لونڈیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔" (ص ۵۵-۵۴)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ روس کے باہر تو اشتمالیوں نے اپنے کو مسلمانوں کا ہمدرد ظاہر کیا، اور اپنے حدود کے اندر اُن کو مذہب اور ملت سے الگ کرنے کی سرگرم مہم شروع کردی۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب ہوا اور اُنتیس سال کے بعد خالص ایشیائی علاقوں میں اسلام اور مسلمانوں کا جو حال ہو چکا تھا اس کا ایک سرسری اندازہ اوپر کے بیانات سے ہوا ہو گا۔

وسط ایشیا کی خالص مسلم آبادی میں روس کے "پنچائتی پرجاراج" کے کارندوں نے کس طرح مسلمانوں کو ستایا، اور ان کے شعائر کی کیسی بے حرمتی کی، اور ان کو "بد قوما" بنانے (denationalise) کے لئے کیا کیا جتن کئے، اس کی تفصیل ہر با احساس مسلمان بلکہ ہر انسان کو جاننا چاہئے۔ خوش قسمتی سے خود اشتمالیوں نے اپنے جوش و خروش میں خود ہی یہ داستان (جو ہمارے لئے کتنی ہی دردناک ہو) مزے لے لے کر بیان کر دی ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت ایک یہودی النسل امریکی نژاد اشتمالی جوشا کیونٹز (Joshua Kunitz) کی کتاب "صبح سمرقند" (Dawn over Samarkand) ہے، جس میں "اشتمالیت" کے اس مومن قانت نے ایسی حقیقتیں بیان کی ہیں، جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اس کتاب کے اقتباسات پیش کرنے سے پہلے ہم ڈاکٹر زکی علی مصری کی کتاب سے ایک اور اقتباس دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ یہ اس مفصل "داستانِ درد" کے لئے تمہید کا کام دے گا اور اس سے اندازہ ہوگا کہ مساوات و حریت کے علم برداروں نے مسلمانانِ وسط ایشیا کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنے اور اُن کا شیرازۂ حیات درہم برہم (Disintegrate) کرنے کے لئے کیا کیا نہ کیا ہوگا۔

"روسی ترکستان خاص طور پر پُر زور بالشویک پروپگنڈا کا اہم مرکز ہے۔ مرحوم انور پاشا[1]

---

[1] انور پاشا مرحوم کے آخری کارنامۂ حیات اور سویٹ روس کے مقابلہ میں اُن کی مجاہدانہ اقدامات اور پھر "شہادت" کی تفصیل اور بے کم و کاست حالات معلوم کرنے کے لئے پڑھئے "حاضر العالم الاسلامی" (ج ۳۔ ص ۳۶۴۔ ۳۹۵)۔ یہاں پر اتنا ذکر کر دوں کہ اُن کی شہادت پہلی ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو ۹ بج کر ۳۰ منٹ پر آب دریا روسی ترکستان کی چھاؤنی کے سامنے افغانستان کی سرحد سے قریب واقع ہوئی، جب کہ وہ خود روسیوں کی بڑی بھاری فوج کے مقابلے میں ایک معمولی جمعیت کی

(بقیہ حاشیہ)

یہیں ایک بالشویک ایجنٹ کے ہاتھ سے شہید ہوئے؛ جب کہ وہ بالشویکوں کی غداری پر اُن کے خلاف سرگرم جہاد ہوئے تھے"!

تاشقند کی آبادی آج پانچ لاکھ ہے۔ اور سمرقند کو ملا کر یہ روسی وسط ایشیا کا معاشی اور تہذیبی مرکز ہے۔ یہیں مشرق کے مبلّغ تیار کئے جاتے ہیں۔ اُن کی اہم انجمنوں اور سوسائٹیوں (اشتمالی پارٹی کا مرکزی ایشیائی دفتر، وسط ایشیا کی ریلوں کا مرکزی اسٹیشن اور وسط ایشیا کی یونیورسٹی وغیرہ) کے دفتر بھی یہیں ہیں اور یہیں بالشویکوں نے سمرقند کی بڑی مسجد کا منارہ منہدم کر کے اس کی جگہ لینن کا ایک شوکت مجسمہ نصب کر رکھا ہے، جس پر یہ فقرے کندہ ہیں:۔

"آج کے بعد مؤذن مسلمانوں کو اس منارہ سے عبادت کا بلاوا نہیں دے سکے گا، ...... بلکہ لینن بچے ......!"

اب تک جو کچھ سنا، وہ تمہید تھی اُن دردناک حالات کی جو ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے ملک سے قریب اشتمالی روس کے ہاتھوں نمودار ہوئے۔ آپ نے اندلس کی تباہی کی داستان سنی ہے۔ زوالِ بغداد کا مرثیہ پڑھا ہوگا۔ دلی کی بربادی پر بھی آنسو بہائے ہوں گے صقلیہ پر بھی اقبالؔ کی دردانگیز نظم نے بھی آپ کے دل کو متاثر کیا ہوگا۔ لیکن کیا آپ نے سمرقند و بخارا کی بربادی کی کہانی بھی سُنی ہے؟ بغداد اور دلّی میں مسلمانوں کی زوال پذیر حکومتیں برباد ہوئی تھیں۔ اندلس میں بھی زوال اور تباہی کئی صدیوں سے منڈلا رہی تھی۔ لیکن یہاں

(بقیہ ص ۷۸) بنفس نفیس کمان کر رہے تھے۔ شہادت کے وقت وہ ۳۶ گھنٹوں سے مسلسل مشین گن چلا رہے تھے .... رحمۃ اللہ رحمۃً واسعۃً و نضّر وجہہٗ یوم القیامۃ۔

لہ اسلام ان دی ورلڈ ص ۳۶۵ ۔۔ ۳۶۰ ؛ نیز معارف، جولائی ۱۹۳۹ء "دنیائے اسلام" از مسعود عالم ندوی)

وسط ایشیا میں مسلمان قوم تباہ نہیں ہوئی، اسلام برباد ہوا ہے ۔ یہاں مسجدوں کے مسمار کرنے کی نوبت بہت کم آئی ہے، بلکہ خود نمازیوں نے ہنسی خوشی خانہ خدا کو خیرباد کہا، وہاں یہاں آپ دیکھیں گے کہ ہمارے علماء اور مشائخ اپنی سادہ لوحی اور دنیا کے حالات سے ناواقفیت کی وجہ سے کس طرح دین اور اس کے علم برداروں کی بیخ کنی میں نادانستہ آلۂ کار بن جاتے ہیں یہ واقعہ ہے کہ وسط ایشیا میں اشتمالیوں نے پہلے خود "ملاؤں" کی مدد سے ان روشن ضمیر اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کا خاتمہ کیا، جو اشتمالیوں اور روسی حکمرانوں کی چالوں اور مکاریوں کو تاڑ گئے تھے ۔ پھر میدان صاف ہو جانے کے بعد سادہ لوح ملاؤں کو اس طرح ختم کیا گیا، کہ وہاں کوئی رونے والی آنکھ بھی نہیں باقی رہی تھی ۔ آنکھیں تھیں، مگر اشتمالیت اور نئے انقلابی نظام کی چمک دمک سے انھیں چکا چوند لگ چکا تھا ۔

ہم اس امریکی نژاد اور یہودی النسل اشتمالی جوشا کنٹز کے بیان کردہ تلخ حالات خاص طور پر اپنے علماء و مشائخ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ زمانہ حال کی اسلام کی سب سے بڑی حریف قوت کس چابکدستی اور مکاری سے ایک مسلمان ملک اور ایک مسلمان قوم کو نگل جاتی ہے، اور کس طرح اس قوم اور اس ملک کے علماء الحاد کے سیلاب کے سامنے اس وقت تک پڑے رہتے ہیں، جب تک کہ موجیں اُن کے سروں سے نہیں گذر جاتیں ۔ دوسرے دردمند مسلمانوں سے صرف یہ کہنا ہے کہ کل کا انتظار نہ کیجیے۔ آئیے، آج ہی اپنی قوتوں کو منظم کر کے اسلامی نظام کے برپا کرنے میں لگ جائیں ۔ ورنہ قضا کا فیصلہ کسی سست رو کا انتظار نہیں کیا کرتا ۔

اس تمہید کے بعد، جو بے اختیاری اور تاثر کے عالم میں ذرا لمبی ہو گئی؛ ہم "صبح سمرقند"[1]

---

[1] یاد رہے کہ کتاب کا نام "(Dawn over Samarkand)" ہے ۔ اس کے کچھ اقتباسات جیلانی صاحب

کی طرف توجہ کرتے ہیں، جو ہمارے نقطۂ نگاہ سے صبح نہیں، بلکہ گمراہی اور پستی کی تاریک
رات سے زیادہ مشابہ ہے۔ مگر اشتمالی تو اُسے صُبح ہی کہے گا۔

وسط ایشیا، کا تہذیبی مرکز بخارا تھا۔ عرصہ تک یہ سرزمین علم و عمل کا گنجینہ رہی ہے
اللہ جانے، کتنے سینکڑوں، ہزاروں ارباب کمال اس کی خاک میں آرام کر رہے ہیں۔ اسی لئے
بالشویکوں یا اشتمالیوں نے زیادہ توجہ اسی کی طرف کی۔ بدنصیبی سے بخارا کا امیر عالم خاں؛
عام مسلمان نوابوں اور فرماں رواؤں کی طرح حالات سے ناواقف اور تدبر و تجربہ سے
عاری تھا۔ مُلک میں "جدیدیت" کے نام سے روشن خیالی اور اصلاح طلبی کی تحریک ۱۹۰۵ء
ہی سے شروع ہو چکی تھی۔ مگر زار روس کے ساتھ تعاون اور اس کی سرپرستی کی وجہ سے امیر بخارا
نے اس کے دبانے میں کوئی دقت محسوس نہیں کی۔ لیکن روسی انقلاب (۱۹۱۷ء) کے بعد
ان "جدیدیوں" کو سازگار فضا ملی۔ اگر امیر بخارا میں سُوجھ بُوجھ ہوتی تو وہ ان جدیدیوں کو اپنا کر
بالشویکوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ لیکن اس پر زار کی رجعت پسند اور ظالمانہ حکمت عملی کا اثر تھا۔
وہ انقلابیوں کی آواز کو مجذوب کی بڑ سمجھتا رہا۔ انقلاب کے فوراً ہی بعد روس اور مشرق کے
بسنے والے مسلمانوں کے نام" ایک اعلان شائع کیا گیا، جس پر لینن کے دستخط تھے اور ان تمام
قبیلوں سے خطاب کیا گیا تھا؛

"جن کی مسجدیں اور عبادت گاہیں زار روس کے استبداد کی نذر ہو چکی تھیں"

اور انھیں یہ خوش خبری دی گئی تھی کہ اب وہ اپنے مذہب کی پابندی اور مذہبی رسوم کے بجا لانے میں
بالکل آزاد ہوں گے۔

یہ تھی مذہب پر حملے کی بسم اللہ، جس کا آغاز مذہبی رواداری کے وعدے سے کیا گیا

(بقیہ ص ۸۰) کے قلم سے ترجمان القرآن (جلد ۲۹ ۵-۶) میں چھپ چکے ہیں۔ ان سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

لیکن اس کی تکمیل میں دیر لگی۔ یہی وہ سوجھ بوجھ کی پالیسی تھی جو روس کے اشتمالی خداوندوں نے وسط ایشیا میں جاری کی۔

انقلاب کے بعد کچھ دنوں خود جدیدیوں "میں" انقلاب کے مفہوم اور نصب العین کے متعلق اختلاف رونما ہوگیا۔ لیکن جلدی ہی ایک پارٹی بالشویکوں کی مدد سے امیر بخارا کے مقابلہ میں سرگرم کار ہوگئی اور اس نے فوجی پیش قدمی شروع کردی۔ امیر بخارا نے برطانیہ کی طرف امید بھری نگاہیں اٹھائیں، لیکن وہ کوئی خاص مدد نہ دے سکا۔ دوسری طرف بخارا کے کسانوں کی دردناک حالت اور اُن کی فاقہ مستی انھیں خود بخود نئے انقلابیوں کی آغوش میں دھکیل رہی تھی۔ آس پاس کے علاقوں میں، جہاں انقلابیوں کے قدم جم چکے تھے، اپنے ہمسایہ کسانوں کی خوش حالی دیکھ کر وہ اپنی زمینیں چھوڑ کر ترکستانی علاقوں کی طرف منتقل ہونے لگے۔ اس پر طرہ یہ کہ چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر اُن کے پاس انقلاب اور خوش حالی کا خوش آئند پیغام پہنچنے لگا:

"ہم وطن بھائیو! دلیر بنو! انصاف اور قوت تمھاری مدد کے لئے کھڑی ہے۔ خونی زار اپنے کرتوتوں کی سزا پا چکا ہے۔ اب صرف کسانوں اور مزدوروں کی فوج ہے۔ جو ہر وقت تمھاری ہر آواز پر لبیک کہنے کو تیار بیٹھی ہے۔ روس کے آزاد اور آزادی پسند سُرخ سپاہیوں کی جے! زندہ باد انقلابیانِ بخارا"

اب امیر بخارا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انگریزوں سے مدد کی درخواست پر، تجارتی کمیشن کے بہانے سے کرنل بیلی کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا، جس نے بالشویک خطرہ سر پر منڈلاتے

لہ قفقاز کا پورا علاقہ ۱۹۲۱ء میں دوبارہ روس کے زیر نگیں ہو چکا تھا۔ روسی ترکستان، قفقاز اور وسط ایشیا میں مسلمانوں کی جد وجہد کی مختصر سرگذشت کے لئے ڈاکٹر زکی علی مصری کی Islam in the World)

دیکھ کر اپنی رپورٹ میں یہ فقرہ ثبت کیا:

"بالشویکوں کے خیالات (Ideas) جنھیں وہ اپنے ساتھ لا رہے ہیں، زار کی تمام فوجوں سے زیادہ خطرناک ہیں"

ایک طرف ایک زندہ تحریک کی فعال قوت ہے۔ دوسری طرف مسلمان قوم کے ایک فرد (امیر عالم خاں، والیٔ بخارا) کو اس پریشان حالی میں کوئی فکر لاحق ہوتی ہے تو اپنے خزانہ کی۔ برطانی سفیر سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس خزانہ کو اپنے ذرائع سے انگلستان منتقل کرا دے۔ سفیر نے ٹکا سا جواب دیا "اتنی بڑی رقم (۳۰ کروڑ روپے) ان حالات میں حفاظت کے ساتھ نہیں منتقل کی جا سکتی" عبرت کا مقام ہے۔ ایک طرف جان و مال، عزت و ناموس اور مذہبی و قومی آبرو سب خطرے میں ہے، اور دوسری طرف ملک و قوم کے رہنما اور سربراہ کار کو اگر کوئی فکر ہوتی ہے تو اپنے ذاتی خزانے کی —— یہی وہ اخلاقی انحطاط تھا، جس کے باعث وسط ایشیا کے مسلمان اشتمالی سیلاب کے مقابلے میں زندگی (اور ایمانیت) و وفا کا ثبوت نہ فراہم کر سکے۔

بہر حال جو ہونا تھا سو ہو کر رہا۔ بخارا پر انقلابیوں کا قبضہ ہو گیا (آغاز ۱۹۲۰ء)۔ امیر بخارا نے راہ فرار اختیار کی۔ اور ۲۴، مارچ ۱۹۲۱ء کو بخارا کی حکومت، بخارا کی پنچایتی جمہوریت (Soviet Republic of Bukhara) بن گئی۔

اس کے بعد بھی مذہبی طبقوں اور سادہ پُرجوش مسلمانوں نے 'جہاد' کے نام پر مسلسل جدوجہد جاری رکھی۔ خوش قسمتی سے انور پاشا مرحوم ماسکو سے بددل اور ان کی نیتوں سے خبردار ہو کر قسمت آزمائی کے لئے کسی طرح اس علاقے میں پہنچ گئے۔ بے ترتیب دستوں کی تنظیم کی، اور عوام کو مقابلہ پر ابھارا۔ مگر جس قوم کے اخلاق کو گھن لگ چکا ہو جب قومی اخلاق

بگڑ چکا ہو، جو بنیادی اخلاقیات سے محروم ہو چکی ہو۔ وہ ایک زندہ معاشی اور سماجی تحریک کے مقابلے میں کس طرح ٹھہر سکتی تھی؟ اس کے مقابلہ کے لئے اسلام کی ضرورت تھی۔ اسلامی اخلاق سے آراستہ اور اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا اور اسلامی سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک امت کی ضرورت تھی۔ مگر وہ کہاں؟ اسلام کی وہ قوتِ حیات اور امتِ مسلمہ کا وہ کس بل تو عرصہ ہوا دم توڑ چکا تھا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اُن کی ہڈیاں پھولوں میں رہیں، مرحوم انور نے اپنی سی ہر کوشش کر دیکھی، مگر مسلمانوں کی بداعمالیاں مدت دراز سے غلامی اور پستی کو دعوت دے رہی تھیں۔ شکست اُن کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔

انور کی حیثیت ایک شکست خوردہ جرنیل کی تھی۔ پہلی بڑی لڑائی میں ترکی کی ہار کے بعد وہ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اور دو سال کی بادیہ پیمائی کے بعد پھر میدانِ جہاد میں آ گئے۔ اُن کے ساتھی طلعت (وزیر اعظم ترکی۔ اختتام جنگ ۱۹۱۸ء تک) وغیرہ تو اپنی سیاسی موت کا فیصلہ کر کے گوشہ نشینی پر قانع ہو چکے تھے۔ مگر انور کے یار غار اور مشہور عربی مفکر امیر شکیب ارسلاں (وفات ۱۹۴۶ء) کی زبان میں انور کے ہاں صلح والتوائے جنگ ایک منفی چیز شمار ہوتی تھی۔ آخر تقدیر انھیں بخارا اور وسط ایشیا کے میدان کارزار میں لے آئی۔ انور گو ہارے ہوئے تھے، مگر اُن کا دبدبہ اور رُعب اب بھی دشمنوں کے دلوں پر قائم تھا۔ جُوں ہی انھوں نے وسط ایشیا کی گوریلا فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی، دشمن کے کان کھڑے ہو گئے۔ مسلمان قوم کے افراد تیزی کے ساتھ اشتمالیت کی طرف جا رہے تھے، اب مخالف پروپگنڈا اور تیز ہو گیا۔ اس وقت کی حالت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے انور پاشا کا ایک خط پڑھئے جو انھوں نے بخارا کے کمیونسٹوں (یعنی مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے کمیونسٹ) کے نام لکھا تھا،

".... کیا یہ آپ ہی لوگ نہ تھے جنھوں نے بالشویکوں کی مدد سے بخارا کو تاراج کیا؟
بے گناہوں کے خون کی ندیاں بہادیں؟ اور اُن کا بچا کھچا اثاثہ بھی لوٹ لیا؟ کیا یہ آپ ہی نہ تھے
جنھوں نے مسجدیں اور مدرسے تباہ کئے، ہمارے غریب اور متوسط الحال طبقوں کو بورژوا
اور جاگیر دار پکار کر اُن کی زندگیاں تباہ کیں اور اُن کی جائدادیں لوٹ لیں؟ محض روٹی
کے ٹکڑوں کے لئے تم نے ملعون روسیوں کے ہاتھوں اپنا دین، اپنا ایمان اور اپنا ضمیر
فروخت کر دیا....؟"

انور پاشا نے بڑی محنت اور تن دہی سے مختلف قبیلوں کو ایک رشتہ میں منظم کیا اور انھیں
بُنیانِ مرصوص بنانے کی کوشش کی، مگر جب ایمان نہ ہو تو وقتی جوش و خروش سے کچھ نہیں ہوتا۔
اندرونی رقابت اور حریفوں سے ساز باز شروع ہو گئی۔ مقامی سردار ایک ایک کر کے الگ ہونا
شروع ہو گئے۔ بے یار و مددگار انور ایک معمولی جمعیت کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے
اور وسط ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کے اُبھرنے کی توقع ایک عرصہ کے لئے جاتی رہی ––
(اگست ۱۹۲۲ء) اللہ کی رحمت ہو مردِ پاکباز پر اور اُس کی تربت پر انوارِ رحمت کی بارش ہو۔
یہ اس داستانِ الم کا ایک ورق تھا، جسے راقم نے مختصر سے مختصر طریقے پر بیان کرنے کی
کوشش کی ہے اور جو اس کتاب (صبحِ سمرقندی) کے کئی سَو صفحوں میں پھیلی ہوئی ہے۔
انور مرحوم کی شہادت کے بعد داستانِ الم کا دوسرا ورق شروع ہوتا ہے۔ بچی کھچی گوریلا
فوج ایک مقامی سردار کی زیرِ قیادت منظم ہوئی۔ لیکن بالشویکوں نے اب اپنے پینترے
بھی بدل ڈالے۔ اب انھوں نے فریب کاری اور چال بازی کو اپنا ہتھیار بنایا۔ مسلمان قوم
میں علماء کو سب سے زیادہ سادہ لوح پا کر پہلا وار ان ہی پر کیا گیا۔ بڑے معصوم انداز میں
یہ اعلان کیا گیا کہ بالشویک مذہب کے محافظ ہیں۔ وہ تو صرف مُلک کی معاشی اور عام سماجی

حالت درست کرنا چاہتے ہیں۔" بس پھر کیا تھا، علماء اٹھے اور بالشویکوں کی تعریف میں رطب اللساں ہو گئے اور خود اپنی قوم کے لڑنے والوں اور جان کی بازی لگانے والوں کی سخت مذمت کی۔ یہ مصنف لکھتا ہے،

"حکومت نے تہیہ کر لیا کہ کسی نہ کسی صورت میں گوریلا گردیوں کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس لئے انھوں نے مالداروں کو یقین دلایا کہ اُن کی دولت محفوظ ہے۔ اور مذہبی طبقوں کے یہ ذہن نشین کیا کہ وہ مذہبی مراسم کے بجالانے میں بالکل آزاد ہیں۔ مسجدیں بالکل محفوظ تھیں۔ ان دنوں علماء پر کوئی تنقید نہ کی جاتی۔ حکومت نے اپنا رویہ ایسا بنالیا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مذہب سے بالکل بے تعلق ہے۔ بالشویکوں کا یہ طرز عمل کچھ ایسا کارگر ثابت ہوا کہ مسلمان علماء و مشائخ بالشوزم کے ثناخواں اور ہمارے حریفوں ـــ گوریلا دستے ـــ کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے (ص ۱۴۷)

علماء کی سادہ لوحی سے اشتراکیوں نے ایک اور فائدہ اٹھایا۔ "طبقاتی نزاع" کے نظریئے کے مطابق غریب علماء کو مالدار علماء کے خلاف اکسایا گیا۔ کچھ سادہ لوح بالشویکوں کے دامِ فریب میں اس طرح آئے کہ اشتراکیت اور بالشوزم کی تائید میں قرآن وحدیث کے حوالے دینا شروع کر دئیے۔

ایک مشہور عالم فخرالدین خدیو لکھتا ہے:

"میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت نے اپنے آپ کو مفلسوں اور فاقہ مستوں کا حامی اور کفیل ثابت کر دیا ہے۔ حکومت غریب طبقوں کے درمیان زمینیں بانٹ دینا چاہتی ہے۔ یہ فعل نبیؐ کی عین سنت ہے۔ جو یہودیوں کا محض اس لئے قرض دار ہو گیا تھا کہ وہ مسکینوں اور بےکسوں کا پیٹ پالا کرتا تھا۔" (ص ۱۸۰)

ایک عالم پر اشتراکیت کا جادو ایسا چلا کہ وہ اپنے پچھلے وعظ و پند اور مذہبی تعلیمات کے پھیلانے پر پشیمانی اور شرمندگی کا اظہار کرنے لگا:

"علماء اور جاگیرداروں کے فریب میں پھنس کر میں کئی سال تک جامع مسجد کے منبر سے غریبوں کے دماغوں میں طرح طرح کی مہمل باتیں ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہا۔ اب مجھ پر حقیقت کھل گئی ہے۔ مالدار علماء کے بیانات سے یہ بات آئینہ ہو گئی کہ قرآن و حدیث کو ان لوگوں نے معاشی آلہ کار بنا رکھا تھا۔ میں تمام لوگوں اور سوویٹ حکومت کے سامنے حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ اب میں اسلام کا نام لیوا نہیں رہا۔ اس پر اب میرا ایمان نہیں۔ وہ تو صرف انسانوں کو فریب دینے کے لئے ایک ڈھکوسلا بنایا گیا تھا۔" (ص ۱۸۱)

جب یہ عالم ہو خود مذہب کے علم برداروں کا، تو پھر اشتراکیوں کو اپنے خیالات کو پھیلانے اور وسط ایشیا کو اشتراکی رنگ میں رنگ دینے سے کون چیز روک سکتی تھی؟ ہر قدم پر بالشویکوں کو ان ہی علماء سے مدد ملی۔ جب بعض علماء نے مسلمانوں کو غیر منصفانہ زرعی تقسیم کے خلاف ابھارا، تو اشتراکیت کے حلقہ بگوش نام نہاد علماء قرآن و حدیث سے اس کے حق میں دلیل لائے (ص ۱۷۹) نتیجہ ظاہر تھا۔ مذہبی محاذ ٹوٹ گیا اور متشدد سے متشدد عالم بھی غیر جانب دار ہو گئے (ص ۱۸۱) اور اس یہودی نژاد مصنف کی زبان میں:

"اسلام کی تاریخ میں پہلی بار قانون الٰہی کو ترک کر کے الحاد اور بالشوزم قبول کر لیا گیا۔" (ص ۱۸۱)

خود سے اعتراف ہے کہ:

"بالشویکوں کا زبردست سے زبردست خلاف مذہب پروپگنڈا بھی اتنا موثر اور مذہب کے لئے اس قدر تباہ کن نہ ثابت ہوتا، جتنا خود ان خادمان دین کی حماقت اور خود غرضی

سے ان کے مذہب کو نقصان پہنچا۔"

مذہبی قلعہ کو فتح کرنے کے بعد اشتمالیوں یا بالشویکوں نے اپنے تعمیری کام شروع کردئے۔ مدرسے، تعلیم گاہیں، کلب، زراعتی فارم اور پروپگنڈا کے مختلف ادارے تیزی کے ساتھ گاؤں گاؤں کھلنے لگے۔ اور سب کام اس طرح انجام پایا کہ گو سب کچھ ماسکو کے آسمان سے بطور "شریعت" نازل ہوتا تھا، سادہ لوح مسلمان سمجھے کہ یہ جمہور کی رائے ہے" اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری اپنی رائے سے ہو رہا ہے"۔ یہ قرارداد اُن کے ہاں پہلے ہی منظور ہو چکی تھی (بخارا کانگریس ۱۹۲۴ء)۔

"مزدور طبقہ کی رائے عامہ سوویٹ حکومت کا قانون ہوتا ہے"۔ (ص ۵۴)

دیہاتوں میں اور غریب کسانوں کو نت نئے زرعی اور معاشی منصوبوں میں شریک کرنے کے لئے اشتراکیوں نے جو طریقے استعمال کئے اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ صرف ایک مثال کافی ہوگی۔ اگر اس کا بیان کرنے والا ایک پُرجوش کمیونسٹ نہ ہوتا، تو شاید بہتوں کو یقین بھی نہ آتا[ل]:

"ان کی ترغیب کے طریقے اس سے زیادہ انوکھے تھے۔ بعض پُرجوش زرعی منتظموں نے اعلان کیا کہ جو شخص مشترک زرعی فارم میں شامل ہوگا، ہم اسے ایک بیوی عطا کریں گے اور بعض بعض نگراں کار تو شراب پی کر اس قدر بدمست ہوتے کہ وہ برملا کسانوں کے سامنے اس طرح کی تقریریں کرتے:

"اللہ کی مدد سے (!) ہم نے تمہارے مویشی تو ہتھیا لئے ہیں۔ اب تیار ہو جاؤ

ل اس یہودی النسل کمیونسٹ کی صاف گوئی اور تلخ بیانی کا یہ عالم ہے کہ میرے مسلمان نامی کمیونسٹ دوست نے جب میری طلب پر یہ کتاب دی تو وہ انتہائی ندامت سے کہنے لگے، اس مصنف میں یہودی تعصب کے اثرات رہ گئے ہیں اور اس کا لہجہ مسلمانوں کے باب میں ہمدردانہ نہیں"!

تمھاری بہو بیٹیوں کا بھی ایک اجتماعی (Collective) انتظام کرنے والے ہیں۔ ہم انھیں اپنے ساتھ رکھیں گے اور ساتھ سلائیں گے۔ اس صورت میں ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح گھل مل جائیں گے (ص ۱۹۲)۔

ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ آغاز کار میں انقلابیوں نے مذہبی آزادی کے کیسے سبز باغ دکھائے تھے؟ مگر وہ ۱۹۱۸ء کی باتیں تھیں، جب وسط ایشیا میں بالشویکوں کے قدم جمنے نہیں پائے تھے۔ اب ذرا ۱۹۳۰ء اور اس کے بعد کی رُوداد سُنئے۔ معمولی مذہبی رجحان پر کس طرح کی سزائیں دی جاتی تھیں، اس کا اندازہ اس اقتباس سے ہو گا:

"کوکند کے ایک گاؤں میں دس کسان اجتماعی زرعی فارم کی ممبری سے صرف اس بناء پر الگ کر دئے گئے کہ وہ مسجد میں نماز ادا کرتے دیکھے گئے۔ ایک دوسرے گاؤں کا اجتماعی فارم محض اس وجہ سے توڑ دیا گیا کہ اس کے ممبر مسجد جانے پر مصر رہے۔ بخارا کے اطراف میں بعض پُرجوش افسروں نے لاش کا جلانا ضروری قرار دیا۔ ایک ضلع میں ایک لکھے پڑھے اشتمالی نے بعض کسانوں کو اجتماعی زرعی فارم سے صرف اس لئے نکال دیا کہ وہ اس کے "علمی" سوالوں کا جواب نہ دے سکے، وہ سوال کیا تھے؟ اشتراکیت کیا ہے؟ ڈارون کا عہد زندگی کیسا تھا؟ (ص ۱۹۲)

یہ سلسلہ لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ مگر اشتراکیوں کے جوڑ توڑ کے سمجھنے اور ہندِ مُلک کو ان کی تباہ کاریوں سے بچانے کے لئے ان حقائق کا جاننا ضروری ہے۔

وسط ایشیا میں جس طرح انھوں نے بے دینی اور اپنا معاشی دین یعنی نظام حیات پھیلایا، اس کا اندازہ تو آپ کو ہو گیا ہو گا۔ لیکن ان کی پالیسی ہر جگہ یکساں نہیں رہی۔

کمیونسٹ کی صحیح تعریف یہ ہے کہ وہ مصلحت پرست اور ابن الوقت (Opportunist) ہوتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد جہاں کہیں مسلمانوں میں مذہبی حرارت ذرا تیز معلوم ہوئی، انھوں نے تدریج کی پالیسی پر عمل کیا۔

ایک اشتراکی سیاح نے بخارا[1] کے نائب صدر سے اس بات پر اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ بعض کمیونسٹ ابھی تک مذہبی مراسم بجا لاتے ہیں۔ اس کے جواب میں بخاری کمیونسٹ کا یہ بیان غور سے پڑھیے:-

"ہم اس چیز سے ہراساں نہیں۔ سب سے پہلی چیز جو ہم ایک شخص میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بورژوا طبقہ سے زمین چھیننے میں وہ ہمارے ساتھ ہے یا نہیں؟...... آپ کو یہ بات ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔ عوام کو اپنے ساتھ ملانے میں ہمیں اپنے اندر کچھ نہ کچھ لچک ضرور پیدا کرنا پڑے گی۔ ہم محض کاغذ، قلم اور خیال آرائی سے نہیں کھیل سکتے۔ جو شخص ہم سے متاثر ہو کر ہمارے قریب آتا ہے؛ وہ ہماری تعلیم و تہذیب کے بھی قریب آئے گا۔ ہم اس وقت انقلابی دور سے گذر رہے ہیں اس لئے طرح طرح کے ارکان کا ہماری پارٹی میں داخل ہو جانا کوئی انوکھی بات نہیں"
(ص ۲۱۲)

اسے کہتے ہیں اشتمالی زبان میں "چال" (Tactics) اور آپ نے سنا ہوگا کہ لینن اس کا بڑا ماہر تھا۔ مگر یہ "لچک" عارضی تھی۔ حالت رفتہ رفتہ بدلتی گئی اور ۱۹۳۶ء میں تعلیم یکسر غیر اسلامی ہو چکی تھی۔ اور نئی پود خالص اشتراکی اور بے دین ہو کر پروان چڑھ رہی تھی؛ اور وہ شاذ و نادر مدرسے، جن میں قرآن کے سوا اور کوئی تعلیم نہ دی جاتی تھی، اب خواب

---

[1] جس بخارا کے ساتھ امام بخاریؒ اور ان جیسے سینکڑوں بلکہ ہزاروں بزرگوں کے نام وابستہ ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اس بخارا کے ساتھ کمیونسٹ کی نسبت کرتے ہوئے کیسی تکلیف ہو رہی ہے۔ مگر ہے یہ حقیقت خواہ

وخیال ہوتے جا رہے ہیں۔ پرانے قسم کے مدرس اور طالب علم بھی اب ناپید ہو گئے ہیں۔ (ص ۲۳۷)
تاجکستان کے معلموں کی تعریف میں یہ "قصیدہ منثور" ملاحظہ ہو:

"وسطی ایشیا کا معلم رجعت پسندی اور فساد کا بدترین دشمن اور اشتمالی مقاصد کا گہرا دوست اور سرگرم حامی ہے۔ دیہاتی معلم بیدار تاجکستان کی نشانی ہے۔" (ص ۲۴۹)

مصنف کے بیان کے مطابق تاجکستان "دین اسلام اور دین مارکس ولینن کی باہمی آویزش وپیکار" کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ دنیا میں کوئی نظام اس لئے غالب اور ہمہ گیر ہوتا ہے کہ اس کے ماننے والے غالب اور ان کے طریقۂ دعوت وتبلیغ میں تاثیر اور ہمہ گیری ہوتی ہے۔ "دین مارکس" کے پیرو غالب اور تمام مادی وسائل سے مسلح تھے۔ دین اسلام کا نام لینے والوں کے پاس نہ صحیح اسلامی تعلیم تھی، نہ اس کے علماء اور رہنماؤں میں دین کا صحیح فہم تھا، اور نہ ان میں اس کی خاطر مرمٹنے کا وہ جذبہ ہی تھا، جو مسلمانوں کی خاص خصوصیت رہی ہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ جو ہوا آپ جان چکے ہیں۔ کچھ اور سن لیجئے:

"مسجدیں کلب میں تبدیل ہو گئیں اور ان پر سرخ جھنڈے نصب کر دیئے گئے۔ یوں یہ قصہ ختم ہونے کو آیا۔" (ص ۲۴۹) "اور ہر گاؤں میں ایک "سرخ چائے خانہ" بن گیا۔ اور اکثر دیہاتوں میں ہم نے مسجدوں میں نئے اسکول دیکھے۔" (ص ۲۵۰)

اس کے بعد مصنف نے بڑی تفصیل سے عورتوں میں اشتراکی تہذیب اور اشتراکی فکر کے عام کرنے کی مہم کا ذکر کیا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح آہستہ آہستہ مسلمان عورتوں کو رام کیا گیا، تاآنکہ وہ خود برقعوں کو "سیاہ کفن" کے نام سے یاد کرنے لگیں۔

"پھر ترکستان کی مرکزی مجلس عاملہ نے محسوس کیا کہ اب تعدد ازدواج اور شادی بیاہ کی دوسری معیوب رسموں کو ممنوع قرار دیا جائے۔" ص ۲۷۹)

خدیجہ (Khoziat) نامی ایک سرگرم کمیونسٹ عورت کی داستان مصنف خود اسی کی زبانی سناتا ہے۔ وہ عورت اپنی کہانی بڑی موثر زبان میں بیان کرتی ہے کہ وہ کس طرح گھر سے نکل کر کمیونسٹ سوسائٹی میں پہنچتی ہے، اور اشتراکی خیالات سے مانوس ہوتی ہے۔ اور داستان کے آخر میں ایک مدت کے بعد اپنی ماں سے ملنے کا حال بیان کرتی ہے۔ غریب بوڑھی ماں اپنی لڑکی کو ایک عرصہ کے بعد اس حال میں دیکھتے ہی بے ساختہ پکار اٹھتی ہے :-

"حیف! خدیجہ!! حیف!!! تو نے مجھے مسلمان کی نگاہ میں ذلیل کر دیا۔ اے کاش! میں اس سے قبل مرچکی ہوتی" (ص ۲۰۰)

ہر دور کا ادب، اس عہد کے خیالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ اور موجودہ دور میں تو اس بات پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے کہ ادب اور شاعری کو زندگی اور اس کی حقیقتوں سے ہم آہنگ ہونا چاہیئے۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں موجودہ ترکستانی ادب کے نمونے بھی دیئے ہیں۔ ہم اُن میں سے ایک دو انتخاب آپ کی خدمت میں پیش کر کے اس سلسلے کو ختم کرتے ہیں۔ ایک روشناس شاعر کہتا ہے :

"آج ہماری تعطیل ہے۔

ہم اسے روزہ کے نام سے پکارتے ہیں۔

اور ماضی بعید میں یہ کیسی عجیب تعطیل تھی!

اب کس کے پاس روزے کی بابت سوچنے کا وقت ہے؟

محکوم ماضی کی اس واہیات رسم کے لئے اب کس کے پاس وقت ہے؟ (ص ۳۳۴)

اس مسخرہ پن اور دین کے ساتھ مذاق و استہزا کی ایک اور مثال سنیئے۔ ایک مشہور

ادیب صدر الدین عینی اپنی بھائی کی وفات پر ایک نظم لکھتا ہے، جس کے آخر میں یہ فقرے ہیں:

"اے آسمانوں کے حاکم، تم ہی، ہاں، صرف تم ہی اس جُرم کے مرتکب ہو"

اور جب آسمان سے کوئی جواب نہیں ملتا، تو وہ پکار اٹھتا ہے:

"ہاں یہ خالی خولی آسمان گونگا ہے" (ص ۳۴۲)

عینی جدید خیالات کا علم بردار ہے۔ جوں جوں اشتمالی اثرات بڑھتے گئے، اس کی بے باکی اور خیالات کی تندی بھی بڑھتی گئی۔ پہلے یہ خدا کا قائل تھا۔ انقلاب کی کامیابی کے بعد خیالات کی تندی نے انکار باری پر جا کر دم لیا۔ وہ کہتا ہے:

"یہ انقلاب اللہ کا کام نہیں۔ اللہ کو اس کاروبار سے کیا سروکار؟ یہ معجزہ اللہ اور اس کے رسولوں کا نہیں۔ بلکہ مزدوروں کے زورِ بازو کا نتیجہ ہے" (ص ۳۴۳)

جدید اردو ادب کے پڑھنے والے اس سے اپنے ہاں بھی ہوا کے رُخ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

اب ہم اس تفصیلی رودادِ الم کے آخر میں زیر نظر کتاب 'صبح سمرقند' Dawn over Samarkand کا وہ آخری ٹکڑا درج کرتے ہیں جس پر مصنف نے کتاب ختم کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب ترکستان میں اسلام ختم ہو چکا ہے۔ مارکس اور لینن کا بنایا ہوا دین چل رہا ہے اور بڑھ رہا ہے اور وسط ایشیا کی پہاڑیوں اور بیابانوں سے یہ آواز سنائی دیتی ہے:

"ملا! اب تم ادھر کا رُخ نہ کرنا۔ تم ہماری پہاڑیوں کی آوازیں سُن رہے ہو! وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ صدیوں ہم خدا اور اس کے رسول کی شریعت کی رہنمائی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ لیکن کوئی تغیر نہیں۔ کسی انقلاب کا نام نہیں۔ دیکھو! ہماری چوٹیاں کانپ رہی ہیں، ان کے یخ بستہ وزنی چٹان تمہیں کچلنے کے لئے لڑھکتے آرہے ہیں۔ ہم تمہیں نہیں چاہتے۔ جاؤ، چلے جاؤ! ہم اپنی بھولے بھالے عوام اور اپنی سادہ لوح مخلوق کو تمہاری تعلیمات سیکھانا چاہتے ہیں"

____ یہ تھی مصنف کی زبان میں "صبح سمرقند"۔ برعکس نہند نام زنگی کافور، شاید ایسے ہی موقع پر کہا گیا ہو۔ بہر حال ایک مسلمان کی نگاہ میں یہ جاہلیت اور گمراہی کی بھیانک رات ہے، جو وسط ایشیا پر اپنا سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور چین و ملایا کی راہ سے اپنا دامن برابر پھیلاتی جا رہی ہے۔ جانے، سپیدۂ صبح کب نمودار ہوتا ہے؟ جانے یہ الحاد کی گھنگھور گھٹا اسلام کے علم برداروں کو بھی دکھائی دیتی ہے یا نہیں؟ ؎

آنکھیں جو کچھ دیکھتی ہیں، لب پہ آسکتا نہیں

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (اقبال)

یہ سطریں لکھ چکا تھا کہ ڈاکٹر زکی علی مصری کی کتاب "دنیا میں اسلام" (Islam in the World) کا دوسرا ایڈیشن (لاہور، ۱۹۴۷ء) ملا۔ اس میں انھوں نے مزید معلومات فراہم کی ہیں۔ زکی علی مصری ایک نہایت مخلص مسلمان ہیں اور بین الاقوامی حالات سے اچھی طرح واقف۔ ۱۹۳۲ء سے وہ یورپ میں مقیم ہیں اور آج کل جنیوا میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ گو اُن کا اصلی فن اور پیشہ سرجری (جراحی) ہے۔ اور اپنے فن میں اچھی خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ____ اس دوسرے ایڈیشن میں، جو انھوں نے ۱۹۴۶ء میں مرتب کیا ہے، روس اور روسی مظلوم مسلمانوں کے متعلق بھی ایسی معلومات دی ہیں، جو اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ یہ واضح رہے کہ زکی علی اشتہار باز یا محض پروپگنڈا کرنے والے نہیں ہیں۔ وہ ایک سنجیدہ طالب علم اور محتاط محقق ہیں۔ گو ان کا نقطۂ نگاہ سیاسی وحدت اور قومی ترقی سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ بہر حال سوویٹ روس میں مسلمانوں

لہ "اسلام ان دی ورلڈ" کے پہلے ایڈیشن پر راقم کا ایک مبسوط مضمون معارف (جولائی ۱۹۳۹ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

کی نئی افتاد کے متعلق وہ لکھتے ہیں :-

" دوسری بڑی لڑائی کے دوران میں روس نے پچاس لاکھ مسلمان بھرتی کئے ، جن میں تقریباً ۹۰ فی صدی ختم ہوگئے - روسیوں نے ان لوگوں کو خطرناک محاذوں (سیبستوپول ، اسٹالن گراڈ ، برلن) پر اگلی صفوں میں رکھا - اس طرح وہ ایک پنتھ دو کاج کرنا چاہتے تھے ، جس میں وہ کامیاب رہے - ایک تو بہادر ترین دستے اِن جگہوں پر متعین ہوں جہاں اُن کی بڑی ضرورت تھی - دوسرے ان مسلمان قوموں کی تعداد کو کم سے کم کرنا ، جن کی وابستگی اور روسی نظام کی وفاداری سے وہ مطمئن نہیں تھے - حقیقت میں یہ طرزِ عمل سوویٹ روس کی پالیسی کے عین مطابق تھا - وہ مسلمان قوم سے ہر وقت خطرہ محسوس کرتے ہیں - ان کا فنا کرنا ـــ روسیوں کے خیال میں ـــ سلاوی (Slav) نسل کی فلاح وبہبود کے لئے مفید رہے گا -

پانچ لاکھ سے زیادہ مسلمان جرمنوں کے ہاتھ اسیر ہوئے - یہ زیادہ تر لڑائی کے ابتدائی زمانے میں پیش آیا - یہ بھی واقعہ ہے کہ اُن کی بڑی تعداد نے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو جرمنوں کے حوالہ کر دیا - ایک طرف تو انھیں اشتالیوں سے دلی نفرت تھی ، دوسری جانب ان ترکستانی مہاجروں کے پروپگنڈوں نے انھیں متاثر کیا ، جو روسیوں کے مظالم سے تنگ آکر جرمنی میں عرصہ سے مقیم تھے - سچی بات یہ ہے کہ ان مسلمان فوجیوں پر غداری یا بغاوت کا الزام نہیں عائد ہو سکتا - اس لئے کہ انھوں نے روس کی اطاعت دل سے نہیں قبول کی - جرمنوں کے حملہ اور فتح سے انھیں غلط یا صحیح نجات کی راہ نظر آئی - انھیں نازیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی -

مگر روسی حکومت نے ان فوجیوں سے سخت انتقام لیا - اُن کی پوری آبادی کو

زرخیز خطوں سے نکال کر بنجر اور ویران علاقوں میں منتقل کر کے دم لیا۔ بوڑھوں، عورتوں، اور بچوں کو بھی معاف نہیں کیا گیا۔ کریمیا اور شمالی قفقاز کے مسلمان جو اس لپیٹ میں آئے۔ بُری طرح تباہ و برباد کئے گئے۔ (اسلام اِن دی ورلڈ: طبع دوم، ص ۳۵۱-۳۵۲)

ہم نے ابھی کہا ہے کہ زکی علی مسلمان قومیت کے تصور سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں روس میں اُسلام، کا زوال انھیں دکھائی نہیں دیتا۔ مسلمانوں کی تباہی انھیں آٹھ آٹھ آنسو رُلاتی ہے۔ اس موقع پر اپنے ایک کمیونسٹ دوست کا ایک فقرہ یاد آرہا ہے، جو کبھی دل سے محو نہیں ہوتا۔ کئی برسوں کی بات ہے، راقم نے پٹنہ میں ایک اچھے لکھے پڑھے، مطالعہ کے شائق کمیونسٹ نوجوان (جو ماشاءاللہ ایک عالم دین کے صاحب زادے ہیں) سے روس میں مسلمانوں کی زبوں حالی اور تباہی کا ذکر کیا۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اور بے ساختہ بول اُٹھے:۔

"اسلام کی تباہی کہئے۔ مسلمان تو وہاں بہت اچھے حال میں ہیں"

راقم سکتہ میں آگیا۔ اور سر ہلا کر تائید کی ——— بہر کیف ڈاکٹر زکی علی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ روس کی مسلمان قوموں میں کہیں کہیں ایمان کی حرارت ضرور باقی ہے، گو جور و تشدد سے دبی ہوئی۔

(۱۱)

اشتراکیت اور اخلاق

مذہب کے متعلق اشتراکیوں کا رویہ واضح کر دینے کے بعد اُن کے فلسفۂ اخلاق کی تشریح کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، مگر غلط فہمیوں کے سدِّ باب کے لئے اشتراکیت

اور اخلاق" سے متعلق بھی دو حرف عرض کر دینا شاید نامناسب نہ ہو۔

آئیے، پہلے ان کے فلسفۂ اخلاق کو لیں۔ لینن سے بہتر کون شارح مل سکتا ہے؟ سوویٹ یونین کی نوجوان کیمونسٹ لیگ کی تیسری کل روس کانگریس (منعقدہ ۲ر اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں اس نے جو خطبہ دیا تھا۔ اس کا ایک ٹکڑا ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

"سب سے پہلے میں اشتمالی اخلاق پر گفتگو کروں گا۔ تمھیں اپنے کو اشتمالی بنانے کی کوشش کرنا چاہئے...... کیا دنیا میں کوئی چیز اشتمالی اخلاق (Communist Ethics) نامی بھی اپنا وجود رکھتی ہے؟ کیا کوئی اشتمالی ضابطۂ اخلاق بھی وجود میں آیا ہے؟ یقینی اشتمالی ضابطۂ اخلاق ہے۔ بعض حلقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم کوئی فلسفۂ اخلاق نہیں رکھتے، اور بسا اوقات بورژوا کہا کرتے ہیں کہ ہم تمام اخلاقی ضابطوں کے منکر ہیں۔ یہ اُن کے ہتھکنڈے ہیں۔ اسی طرح یہ مسائل کو الجھا کر کسانوں اور مزدوروں کی آنکھوں میں خاک جھونکا کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم کن معنوں میں فلسفۂ اخلاق اور اخلاقی ضابطوں کا انکار کرتے ہیں؟

ہم اُن اخلاقی ضابطوں کے مُنکر ہیں جن کی تبلیغ بورژوا طبقے کی طرف سے کی جاتی ہے۔ اور جو خدا کے احکام سے مُستنبط ہوتے ہیں۔ یقینی ہم کہتے ہیں کہ ہم خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ارباب کلیسا، زمیندار، بورژوا سب اللہ کے نام پر بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں، تاکہ اپنے غاصبانہ حقوق کی حفاظت کرسکیں۔

ہم ان تمام اخلاقی ضابطوں کے منکر ہیں جو مافوق البشر تصوّرات سے ماخوذ ہوں، یا طبقاتی تصادم پر مبنی نہ ہوں۔ ہمارا ضابطۂ اخلاق تمام و کمال طبقاتی تصادم اور پرولتار

(لینن کے خطبات ص ۱۲...)

پرولتاریہ کے طبقاتی تصادم اوران کی ضرورتوں پر ہم اپنے ضابطۂ اخلاق کی بنیاد رکھتے ہیں۔

پُرانا سماج غریبوں اور مزدوروں کے نوچ کھسوٹ اور سرمایہ داروں اور زمینداروں کی سرپرستی پر قائم ہے۔ ہمیں اس سماج کو تباہ کرنا ہے۔ ہمیں ان زمینداروں اور سرمایہ داروں کا تختہ اُلٹنا ہے۔ لیکن اس کے لئے تنظیم کی ضرورت ہے خدا ایسی تنظیم نہیں پیدا کرسکتا (God could not create such organisation)

اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ وہ ضابطۂ اخلاق جو انسانی سماج کے باہر سے لیا گیا ہو، ہماری نئی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ ایک ڈھونگ ہے، ہمارا ضابطۂ اخلاق پرولتاری طبقاتی تصادم کے مفاد کے تابع ہے[1]"

(ص ۸۰-۸۱) (Religion) از لینن)

یہ ہے اشتراکیت کا پرولتاری اخلاقی فلسفہ جس کا خلاصہ آپ نے مارکس کے خلیفہ

---

[1] لینن کے اس بیان کی تہ میں مارکس کا یہ نظریہ کام کررہا ہو کہ کسی دور میں معاشی پیداوار کا جو نظام ہوتا ہے اسی کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ بعض اخلاقی قدریں پرورش پاتی ہیں۔ ہر عمل کو اچھا یا بُرا اسی نسبت سے قرار دیا جاتا ہے، جس نسبت سے وہ مروجہ معاشی نظام کے مطابق دولت کی پیدائش میں معاون ہوتا یا اس میں رکاوٹ پیدا کرتا ہو...... اخلاقی معیار کوئی دائمی قدر نہیں رکھتے، بلکہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں — اخلاق کا دارومدار عام انسانوں کی بھلائی پر نہیں، بلکہ غالب معاشی طبقوں کی بہبود پر ہے۔

سڈنی وب نے اس نقطۂ نظر کی حمایت میں کئی صفحے سیاہ کئے ہیں اور روس کی موجود صنفی انارکزم کو سراہنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا میں قطعی اخلاقیات یا ابدی و عالمگیر اقدار حیات نام کی کوئی چیز نہیں۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (وب کی مشہور کتاب، ص ۲۴۲-۲۴۰)

اور موجودہ روس کے بانی کی زبانی سُن لیا۔ اب اس کے کچھ نمونے بھی ملاحظہ ہوں :۔

جب مذہبی اخلاق نہیں تو پھر پابندیاں کیسی ؟ شادی کا معاملہ ان پابندیوں سے پہلے آزاد ہوا۔ کلیسا کی بے دخلی تو ہو ہی چکی تھی۔ رجسٹری کا ایک دفتر کھول دیا گیا اور یہ اختیار دیا گیا کہ جو مرد و عورت ساتھ رہنے کے خواہش مند ہوں، وہ دفتر میں جاکر نام درج کرالیں۔ مگر آزادی کی رُو میں یہ بھی بار خاطر معلوم ہوا اور آزاد جوڑے بر ملا بلا روک ٹوک گُل چھرّے اُڑانے لگے۔ روسی انقلاب کے بعد اشتمالی نوجوانوں میں یہ روگ اتنا بڑھا کہ خود اشتمالی لیڈر اس انجام سے گھبرانے لگے اور انھوں نے اپنی پیرؤوں کو اس اخلاقی انحطاط سے روکنے کی کوششیں کیں۔ تفصیل میں پڑنے کا یہ موقع نہیں۔ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جس سماج میں معاد کا عقیدہ نہیں ہوگا اور جو معاشرت جزا و سزا کے تصور سے بے نیاز ہوگی، اس کے اخلاقی انحطاط کو کوئی حکومت یا دنیاوی طاقت نہیں روک سکتی۔ اشتمالی روس بھی اس کلیہ سے خالی نہیں انقلاب کے بعد عام اخلاقی انحطاط اور اس کے نتائج سے گھبرا کر اشتمالیوں نے کچھ روک تھام شروع کی، تو اس سے بعض مغربی مبصروں نے قیاس کیا کہ روس پھر پُرانے اخلاقی ضابطوں کا قائل ہوتا جارہا ہے۔ ہمارے ایک ہم وطن سوشلسٹ (ام۔ آر۔ مسانی) اس خیال کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

"یہ واقعہ ہے کہ سی، ام، جوڈر (C.E.M. Joad) اور ان جیسے بعض اصحاب یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ روس کے اشتمالی لیڈر اپنے بلند بانگ دعووں سے پھر رہے ہیں اور ایک ایسی سوسائٹی کا تخیل (جس میں شادی، کنبہ، اور خانہ داری کے جھنجٹ نہ ہوں)، اُن دماغوں سے نکل رہا ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ روس پھر اُن ہی پُرانی اخلاقی ضابطوں کی طرف لوٹ رہا ہے، جو انقلاب کے سیلاب میں خس و خاشاک کی

طرح بہ گئے تھے۔ کوئی شک نہیں کہ نئی سماجی اور صنفی آزادی کے بے جا اور انتہا پسندانہ استعمال کے روک تھام کا خیال پیدا ہو گیا ہے، لیکن اس رجحان سے یہ خیال کر لینا کہ روس پھر پُرانے اخلاقی ضابطوں کی طرف لوٹ رہا ہے، ایسا ہی غلط ہوگا، جیسے یہ سمجھنا کہ سویٹ یونین پھر سرمایہ دارانہ نظام کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔"

(Soviet Side lights ص ۱۸۷)

یہی مصنّف دوسری جگہ روس کی اس "صنفی آزادی" کا خیر مقدم کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"مردوں کے ساتھ عورتیں اور بچّے بھی اب آزادی سے متمتّع ہو رہے ہیں، عورت اب محض جائداد منقولہ (Chattel) نہیں رہ گئی ہے۔ اس نے آزاد انسانیت کے تمام حقوق حاصل کر لئے ہیں۔ شادی اور طلاق کے قوانین اس پر گواہ ہیں۔ عصمت فروشی (Prostitution) کا کامیاب خاتمہ[1] اس انقلاب کا اہم اور نمایاں مظہر ہے، پنچائتی پیرا جاراج میں بچّوں کی تربیت کی ذمہ داری سراسر حکومت کے سر ہے۔" (ص ۸۶)۔

کیوں نہیں؟ جب عورتوں اور مردوں کو ملنے جلنے ساتھ رہنے اور صنفی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی گئی تو پھر عصمت فروشی کی باضابطہ دُوکانوں کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ اب تو ہر ہوٹل، ہر پارک، ہر کوارٹر عصمت فروشی اور صنفی انارکزم کا اڈّا ہے اور حکومت بچّوں کی تربیت اپنے ذمّہ نہ لے تو کیا کرے؟ جب مرد و عورت خانگی زندگی

---

[1] پی۔ ٹی۔ چندر اصاحب اپنی کتاب (Soviet Cyclopaedia ص ۹۹-۹۸) میں اعتراف کرتے ہیں کہ روس میں طوائفیں اب بھی پائی جاتی ہیں — یوں اباحت مطلقہ (صنفی انارکزم) کے بعد طوائفوں کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔

سے محروم ہو رہے ہیں، صبح و شام شریکِ زندگیاں بدلتی رہتی ہیں، تو پھر بچوں کی رکھوالی کون کرے ؟ صنفی انارکزم کی صورت میں اسٹیٹ بچوں کی تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لینے پر مجبور ہے۔ مساتی صاحب نے اس اخلاقی ہیجان اور شادی اور بیاہ کے نئے قوانین کی خاصی تفصیل دی ہے (ملاحظہ ہو: ص ۵۰، ۵۷، ۶۹، ۷۴، ۸۰، ۸۴)۔ اختصار کے خیال سے ہم یہاں اُسے نظر انداز کرتے ہیں۔

مزید برآں یہ حقیقت ہے کہ جنگ کے بعد روس کی اخلاقی حالت بہت زیادہ گر گئی ہے۔ یوں تو تمام یورپی ملکوں اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے والے ایشیائی ملکوں میں جنگ کے بعد اخلاقی انحطاط نمایاں ہے۔ لیکن روس میں یہ ابتری زیادہ ہو گرانی اور چیزوں کی کمی کے باعث جرائم بہت بڑھ گئے ہیں۔ سرمایہ دار نفع اندوزی کے لئے عیش و عشرت کی چیزیں پیدا کرتے تھے روس کا مزدور کارخانہ دار (یعنی حکومت) اُن چیزوں کی پیداوار پر زور دیتا ہے، جن سے حکومت مادی طور پر قوی اور مستحکم ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام باشندوں کو ضرورت کی چیزیں نہیں ملتیں۔ اور مجبوری میں وہ قانون شکنی اور جُرم کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ انحطاط زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ ایک امریکی مصنف (جو جنگ کے دنوں میں اور جنگ کے بعد بھی ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک روس میں رہا ہے) Fredrick C. Barghoom نے ان تبدیلیوں اور اس اخلاقی انحطاط پر اپنے ایک سلسلہ مضمون میں اچھی روشنی ڈالی ہے (ملاحظہ ہو سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور۔ مورخہ ۱۶، ۲۳، ۳۰ نومبر اور ۷، ۱۴، ۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء) اسی سلسلے میں بحث کرتا ہوا یہ امریکی مصنف لکھتا ہے:

"مگر بجائے اس کے کہ یہ لوگ صفائی کے ساتھ ان خرابیوں کی نوعیت اور زیادتی کا اعتراف کریں، جو موجودہ سویٹ سوسائٹی میں پائی جاتی ہیں۔ اربابِ اختیار یا تو اُن کے

وجود کو نظر انداز کرتے ہیں اور یا پھر انھیں سرمایہ داری نظام کے بچے کھچے آثار کہہ کر ٹالنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی زیادتی کی اصلی وجہ وہ معاشی حالات ہیں، جن میں اس وقت سوویٹ روس مبتلا ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام کی ان "نشانیوں" کو اس سرمایہ داری ماحول سے غذا ملتی ہے، جس میں سوویٹ روس گھرا ہوا ہے۔ اسی طرح پر گویا وہ اپنے مارکسی مادی فلسفے کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ایک غیر مارکسی بلکہ مابعد الطبیعی قسم کا حیلہ تراش کر کے اس الزام سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس طرزِ عمل کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے بے دردی کی روش کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان مالکانِ اقتدار کو عوام کے حالِ زار کے متعلق اپنی ذمہ داری کا بھی احساس نہیں۔" (رسول: مورخہ ۷، دسمبر ۴۹ء)

یہ تو اس "اشتمالی فلسفۂ اخلاق" کے سماجی مظاہر تھے۔ سیاسی اور روزمرہ کی زندگی میں اس "فلسفۂ اخلاق" کی فتنہ سامانیاں حد سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اشتراکیوں اور اشتمالیوں کی کتابیں پڑھنے اور اُن سے ملنے جلنے کے بعد ہمیں اس کا مکمل یقین ہو گیا ہے کہ اُن کے آئین میں اخلاق کی کوئی قیمت نہیں۔ ضمیر، دیانت، اور اس قسم کے دوسرے لفظ اشتراکی لغت سے بالکل نکال دئے گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے کو ابن الوقت[1] (Opportunist) کہتے ہیں۔ یعنی یہ عوام اور متوسط طبقوں سے اپنے خیالات صاف صاف نہیں کہتے۔ اُن کی مہم کی ابتدا، اور انتہا سب نفاق پر ہے۔ لیکن اُن کے ہاں نفاق بھی کوئی بُری چیز نہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ مقصد برآری کے لئے ہر کام جائز ہے۔ یہ اپنے کام کا آغاز غریبوں اور گری ہوئی طبقوں کی ہمدردی سے کرتے ہیں۔ ابتدا میں یہ غریبوں کے مذہب سے بالکل تعرض نہیں کرتے۔

---

[1] راقم کے ایک کمیونسٹ ملنے والے دورانِ گفتگو میں زچ ہو کر فرمایا کرتے ہیں:۔

"Communist means opportunist"

سالہا سال تک یہ لوگ معاشی سوال اور "طبقاتی تصادم" کا منضج پلاتے رہتے ہیں۔ جب مواد پک جاتا ہے اُس وقت وہ لامذہبیت کا اظہار کرتے ہیں۔ آج ہندوستان میں بھی یہی حال ہے۔ اور رنج کی بات یہ ہے کہ ہمارے علماء کا ایک اچھا خاصہ طبقہ بھی اُن سے متاثر ہے۔ ایک صاحب تو اپنے کو "مسلم سوشلسٹ" بھی کہنے لگے ہیں، ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

ابھی ابھی آپ وسط ایشیا کے علماء کی سادہ لوحی اور اس کے خطرناک انجام کا حال پڑھ چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس فتنہ سے محفوظ رکھے۔ مومن کی علامت حدیث میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ ایک بل سے دو بار نہیں ڈسا جاتا۔ دیکھئے، ہمارے مُلک کے سادہ لوح علماء اس حدیث کے مفہوم پر کیسی نظر رکھتے ہیں؟

اس باب کے ختم کرنے سے پہلے اشتمالیوں کے اخلاق اور اسلامی مُلکوں میں اُن کی پالیسی کے متعلق ایک غیر مسلم مبصر کی شہادت، ہم پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر زکی علی مصری کے حوالہ سے باکو کانگریس (۱۹۲۰ء) کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اسی کانگریس کے متعلق مزید معلومات حاضر ہیں:۔

"باکو کی بالشویک اور نٹیل کانگریس کی دلچسپ یاد ہمارے ذہن میں ہے، جو آج سے اُنتیس سال پہلے منعقد ہوئی تھی، جس کی کارروائیاں مطبوعہ صورت میں ہم نے بھی دیکھی تھیں۔ اس کانفرنس میں یہ صاف صاف کہا گیا تھا کہ کوئی پروپگنڈا خواہ کتنا ہی ذلیل، جھوٹ اور دغا پر مشتمل ہو، اشتمالی مقصد کے حصول کے سلسلے میں اُسے بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ اخلاق (Morality) کو بالکل الگ کر دینا چاہئے۔ جتنا سفید جھوٹ ہوگا اُتنا ہی جلد کامیاب ہوگا:

(

(The grater the lie, the more readily it prevails) (اسٹیفین افتتاحیہ، دسمبر ۱۹۳۶ء)

کیا اس کے بعد بھی کسی تبصرے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے ؟

(۱۴)

اشتراکیت کا معاشی پہلو

اشتراکیت کی بنیاد پیٹ اور روٹی پر ہے، مگر ہم نے اس پہلو پر اب تک بحث نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ اب اشتراکیت کی حیثیت، ایک مکمل ضابطۂ حیات اور فلسفۂ زندگی کی ہو گئی ہے۔ اس لئے معاشی پہلو پر گفتگو کرنے سے پہلے اس کے نظری اور مابعد الطبیعی گوشوں کو اُجاگر کرنا ضروری ہے۔

"قدرِ زائد" مارکس کی معاشی تعلیم میں قدرِ زائد (Surplus value) کے نظریے کو بڑی شہرت حاصل ہے، اور اس کی سب سے مشہور کتاب "سرمایہ" کا اصل موضوع یہی قدرِ زائد ہی ہے۔ اس لئے اس کی مختصر سی تشریح کرنا ضروری ہے۔ اس کی بنیاد اصل میں قدر کے اس نظریے پر ہے، جس کے مطابق صرف محنت (Labour) ہی قدر پیدا کرتی ہے۔ اصطلاح میں اس نظریے کو محنت کا نظریۂ قدر (The Labour Theory of Value) کہا جاتا ہے۔

مارکس سے پہلے آدم اسمتھ (Adam Smith) اور ریکارڈو (Ricardo) بھی اسی طرح کا خیال رکھتے تھے۔ ان لوگوں کی رائے میں اشیاء کی قدرِ تبادلہ کا اصل معیار مزدور کی محنت ہے۔ مزدور کی اصل محنت ہی اصل قدر (Value)

پیدا کرتی ہے۔ گو آدم اسمتھ نے کبھی یہ نہیں کہا کہ جسمانی محنت ہی قدر پیدا کرتی ہے؛ بلکہ اس نے یہ بھی اعتراف کیا کہ بعض اشیاء کی قدریں کم یابی (Scarcity) اور طلب (Demand) کی بناء پر بھی متعین ہوتی ہیں۔

مارکس نے اپنا نظریۂ قدر (Value) ریکارڈو ہی سے مستعار لیا، لیکن اس کی اپیل عقل کی بجائے جذبہ نفرت سے تھی۔ اس جذبہ نفرت سے جو ایک بے خانماں مزدور کے دل میں سرمایہ داروں کی جانب سے پرورش پاتا رہتا ہے۔ مارکس یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ صرف محنت ہی قدر (Value) پیدا کرتی ہے۔ عقل و استدلال کے بالکل خلاف اس نے یہ نظریہ مزدوروں اور دکھیاروں کے دل و دماغ میں اُتار دیا کہ وہ مظلوم ہیں۔ اُن کی اصلی اُجرت انھیں نہیں دی جاتی۔ ظالم سرمایہ دار اُن کے ہاتھوں کی کمائی ہضم کئے لیتے ہیں۔ اصل میں یہ نظریہ اشتراکی منشور کی باغیانہ روح کے لئے وجہ جواز مہیا کرتا ہے۔

دوسرے ماہرینِ اقتصادیات کی طرح مارکس بھی افادی قدر (Use Value) اور قدرِ تبادلہ (Exchange Value) کے درمیان فرق کرتا ہے۔ ایک چیز اگر انسانی ضرورت کو پورا کرتی ہے تو وہ افادی قدر رکھتی ہے، گو بازار میں اس کی قیمت نہ ہو۔ ہوا کی افادی قدر سے کون انکار کر سکتا ہے، لیکن یہ قدر تبادلہ کی مالک نہیں۔ اس کے برعکس جو چیز قدرِ تبادلہ رکھتی ہے، ضروری ہے کہ وہ افادی قدر بھی رکھتی ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ ایک شے کی قدرِ تبادلہ (Exchange Value) کیا ہے؟ مارکس کہتا ہے کہ اگر ہم اشیاء کی افادی قدر کو الگ کر لیں، تو پھر صرف ایک چیز باقی رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ سب کی سب محنت کی پیداوار ہیں۔

مارکس تسلیم کرتا ہے کہ محنت، نوعیتوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ بُننے والے کی

محنت کاتنے والے سے یقینی مختلف ہوتی ہے ؛ لیکن کیفیت اور نوعیت کے ان اختلافات
کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ محنت کی تمام قسموں میں اُسے صرف اس مشترک حقیقت
سے بحث ہے کہ سب کی سب انسانی محنت ہیں۔ نوعیتوں سے الگ مجرّد محنت ہی محنت کی
پیداوار کو قدر عطا کرتی ہے۔ قیمتوں کی زیادتی کا اندازہ محنت کی زیاتی سے لگایا جائے گا۔
یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ جب اشیاء کی قدر کا تعین محنت کی زیادتی اور کمی سے ہوگا، تو ایک
کاہل اور اناڑی مزدور کی تیار کی ہوئی چیزیں زیادہ قیمتی ہوں گی ؛ اس لئے کہ اُن پر زیادہ محنت
صَرف ہوتی ہے۔ اس کے جواب میں مارکس نے سماجی طور پر ضروری محنت ( )
کی اصطلاح پیدا کی ہے ( ) وہ کہتا ہے کہ سماجی طور پر ضروری محنت
عبارت ہے اس محنت سے جو عادی حالات میں اوسط درجہ کی مہارت سے ایک چیز کی
پیدائش کے لئے ضروری ہو۔ مگر اس پر بھی یہ اعتراض ہوتا ہے کہ سماجی طور پر ضروری محنت کے
ناپنے کا پیمانہ کہاں سے آئے گا؟ پھر اناڑی ( ) اور ماہر ( )
کاریگروں کی محنتوں کے باہمی فرق کا اندازہ کیسے لگایا جاسکے گا؟ رائج الوقت شرح اُجرت
( ) اور قیمت ( ) کا سہارا لئے بغیر یہ کس طرح معلوم کرنا
ممکن ہوگا کہ ایک ماہر کاریگر کی محنت میں ایک اناڑی کاریگر کی محنت کی کتنی اکائیاں ( )
صَرف ہوئی ہیں؟ مارکس نے اس کے بعض طریقے بتائے ہیں، مگر وہ اُلجھاؤ ( )
سے خالی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ریکارڈو اور مارکس کے نظریہ قدر میں تھوڑی سی ترمیم کرلی جائے،
تو اس کی قابلِ قبول توجیہ ہوسکتی ہے۔ جسمانی محنت میں محدود کرنے کے بدلے دماغی محنت
کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے، تو ذرا وسعت اور سمائی پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح

اشیاء کے قدر تبادلہ کی تعیین اور تشخیص میں محنت کے ساتھ ساتھ کم یابی ( ) اور مانگ ( ) کو بھی کافی دخل ہے۔ لیکن یہ توسیع مارکس کا مقصد پورا نہیں کر سکتی؛ اس لئے کہ قدر پیدا کرنے والے عوامل ( ) کی تحلیل و تجزیہ کرنا، اس کا مقصود نہیں۔ اسے تو صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ مزدور مظلوم اور مقہور ہیں اور اس کا آسان نسخہ یہ تھا کہ محنت کے نظریۂ قدر پر سختی کے ساتھ اصرار کیا جائے۔ گو مارکس کی بعض تحریروں میں کچھ لچک کی جھلک ملتی ہے، مگر اشتراکیوں کو یہی ٹھیٹھ نظریہ اپیل کرتا ہے کہ اسی سے مزدوروں کی مظلومیت اور سرمایہ داروں کا نظام بے نقاب ہوتا ہے۔

اس مظلومیت کی مزید عام فہم تشریح یوں کی جاسکتی ہے کہ موجودہ سرمایہ داری نظام میں مزدور بالکل بے خانماں ہے۔ وہ نہ تو آلات پیداوار کا مالک ہے اور نہ وسائل دولت ہی پر اُس کا قبضہ ہے۔ گو اشیاء میں اصلی قدر اس کی محنت ہی سے پیدا ہوتی ہے، مگر وہ اپنی بیچارگی کے باعث سرمایہ دار سے اپنے کام کا معقول معاوضہ نہیں حاصل کر پاتا۔ فاقہ اور پیٹ کی مار کے باعث وہ سرمایہ دار کے ہاتھ اپنی محنت بیچنے پر مجبور ہے۔ سرمایہ دار تو معقول قیمت کے انتظار میں بازار کے اتار چڑھاؤ کا انتظار کر سکتا ہے، لیکن مزدور معقول اجرت کے انتظار میں صبر نہیں کر سکتا۔ اوّلاً تو معدہ تعویق برداشت کرنے کا عادی نہیں؛ دوسرے اگر وہ سرمایہ دار کی مقرر کردہ شرح اجرت قبول نہیں کرتا، تو ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ مبادا دوسرے مزدور (جو اسی کی طرح پیٹ کے درد میں مبتلا ہیں) نہ کہیں اس کام پر لگ جائیں — ان مشکلوں کے باعث مزدور سرمایہ دار کی مجوزہ شرحِ اجرت پر اُس کے ہاتھ اپنی محنت فروخت کرنے پر مجبور ہے۔ یہ سوچنے کی مہلت اُسے نہیں ملتی کہ آٹھ یا دس گھنٹے روزانہ کی واقعی اُجرت کیا اسی قدر ہونا چاہیے جو اُسے مل رہی ہے؟

یہ اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ مارکس کے نزدیک صرف محنت ہی قدر پیدا کرتی ہے۔ کسی شئے کی صحیح سماجی قدر (True Social Value) کا تخمینہ محنت[1] کے پیدا کردہ قدر تبادلہ اور موادِ خام کی قیمت کے مجموعے کو ملا کر کیا جا سکے گا۔ سرمایہ دار اشیاء کی قدر میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ تو اب اشیاء کے صحیح قدر تبادلہ اور ان کی فروختنی قیمت (Selling price) کے درمیان جو فرق ہے، وہی "قدرِ زائد" ہے، جو سرمایہ دار نے مزدور کا حق غصب کر کے حاصل کیا ہے۔ اسے سادہ طریقے پر آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک مزدور ایک روپیہ روزانہ پر آٹھ یا دس گھنٹے کام کرتا ہے۔ اب غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ایک روپیہ آٹھ یا دس گھنٹوں کی مزدوری نہیں۔ یہ تو صرف دو یا تین گھنٹے کی مزدوری ہے۔ باقی پانچ سات گھنٹے جو وہ محنت کرتا ہے یہ اس محنت کے علاوہ ہے، جس کا معاوضہ وہ سرمایہ دار سے پا رہا ہے۔ اس زائد محنت کا نفع اسی نہیں ملتا؛ بلکہ اس زائد نفع سے صرف سرمایہ دار فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی زائد نفع کو مارکس "قدرِ زائد" کے نام سے موسوم کرتا ہے اور یہی زائد قدر ہے، جس سے سرمایہ دار غریب مزدوروں کو لوٹتے ہیں اور یہ لوٹ کھسوٹ صرف اس لئے ممکن ہے کہ سرمایہ دار آفرینشِ دولت کے تمام ذرائع پر قابض ہے۔

یہاں پر مارکس کا ایک اور خیال ظاہر کر دینا مناسب ہوگا۔ جب وہ کہتا ہے کہ "قدرِ زائد" کے ذریعہ مزدور اپنی واجبی مزدوری سے محروم کیا جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر مزدور اپنی پیداوار کی پوری قدر پانے کا مستحق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پوری پیداوار کی قدر ایک اجتماعی حق (Social Right) ہے، جس میں تمام مزدور اپنی اجتماعی محنت کے اعتبار سے برابر کے شریک ہیں۔ اس کی رائے میں پورا معاشی نظام ایک وحدت ہے۔ اس لئے مختلف

---

[1] یہاں محنت سے مراد وہ محنت ہے جو اس چیز کی پیداوار میں صرف ہوتی ہے۔

کارخانوں، اور صنعتوں کے درمیان بھی فرق کرنا ممکن نہیں ہے چہ جائیکہ مختلف انفرادی مزدوروں کے درمیان فرق کرنا ممکن ہو۔ (برٹانیکا، جی، ڈی، ایچ، کول کا مقالہ پڑھئے)

دولت کی مساویانہ تقسیم اور شخصی ملکیت کی منسوخی

"قدر زائد" کے نظریہ اور اس کی فنی موشگافیوں کو چھوڑ کر اشتراکی معاشیات کی تان دو باتوں پر آکر ٹوٹتی ہے۔

(۱) دولت کی مساویانہ تقسیم،

(ii) شخصی ملکیت کی منسوخی،

مساویانہ تقسیم کے بارے میں اشتمالیت کا نصب العین تو یہ ہے کہ سماج میں طبقوں کا اختلاف ختم ہو جائے، ایک مثالی سماج یعنی (Classless society) قائم ہو، جہاں ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق تمام چیزیں مل جائیں۔ مگر یہ "مثالی سماج" ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر مشکل ہی نظر آتی ہے۔ خود اشتراکیوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ آج کل روس میں جو نظام رائج ہے اُسے سوشلزم (اشتراکیت) کا دور کہا جاتا ہے، جس میں پیدائش دولت کے وسائل افراد کی ملکیت سے نکال کر جماعتی ملکیت بنا دئے گئے ہیں اور ضروریات زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا انتظام بھی جماعت ہی کے ذمہ ہے۔ اس طرح پھر وہاں پیداوار کی ایک متعین منصوبہ بندی (Planning) کے مطابق اشیا۔ پیداوار تقسیم کی جاتی ہیں۔ اس نظام میں ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق نہیں، بلکہ اس کی محنت اور کارکردگی کے مطابق ضروری اشیا۔ فراہم کی جاتی ہیں۔ قدرتی طور پر اس نظام میں سماج کے مختلف افراد کی معاشی حالت یکساں نہیں ہو سکتی کہ افراد کی استعداد اور صلاحیتوں میں بڑا تفاوت ہے۔ موجودہ روس میں اسٹریچی کے بیان[1] کے مطابق مختلف افراد کے مابین زیادہ سے زیادہ فرق ایک اور

---

[1] یہ بیان ۱۹۳۶ء کا ہے۔ اس کے بعد حالات تیزی کے ساتھ بدلتے رہے ہیں اور اب وہاں معاشی تفاوت (باقی اگلے صفحہ پر)

پندرہ کا ہے، جو سرمایہ دار ملکوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی اشتراکیت کے بلند بانگ دعووں کے جھٹلانے کے لئے کافی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اشتراکیت کامل معاشی مساوات پر زور دیتی ہے، مگر ذمہ دار اشتراکی اس کی تردید کرتے ہیں۔ البتہ مارکس اور دوسرے اشتراکیوں کی تحریروں سے یہ خیال ظاہر ہوتا ہے اور عام طور پر اشتراکیت بول کر "معاشی مساوات" ہی مُراد لیا جاتا ہے۔ خود اچھے خاصے پڑھے لکھے (Well-read) اشتراکی بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مسٹر ام، آر، مسانی نے بھی اس مسئلہ پر نظر ڈالی ہے:۔

"ایسے لوگ بھی ملتے ہیں، جن کا خیال ہے کہ سویٹ روس اپنے نصب العین سے ہٹ کر مملکتی سرمایہ داری (State Capitalism) کو اپنا شعار بنا رہا ہے۔ اس بیان کی تائید میں روس کے موجودہ عدم مساوات کو پیش کیا جاتا ہے۔ بے شک و شبہ روس میں عدم مساوات ہے اور اس درجہ پر ہے کہ ہر اشتراکی اُسے دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے....... کارخانوں میں معمولی اجرت کی شرح ڈیڑھ سو سے لے کر دو سو روبل ماہانہ تک ہے۔ لیکن اس پنچائتی پرجا راج میں ایسے شہری (اوقاف کے منیجر، مصنف، ایکٹرس) بھی ہیں، جن کی ماہانہ آمدنی پانچ ہزار روبل سے اوپر ہے۔ گاڑیوں میں اونچے اور نیچے

(بقیہ نوٹ) بہت نمایاں ہیں۔ آگے ہم اس پر وضاحت سے روشنی ڈالیں گے۔ لہ.. ان ہی وجوہ کے باعث مارکس اور اینجلز نے نظریے کے طور پر لینن اور اسٹالن نے عملاً یہ تجویز مسترد کر دی کہ سب کو یکساں اور برابر اجرت دی جائے (اسٹریچی، ص ۱۱۰) اس میں شک نہیں کہ سویٹ انقلاب کے ابتدائی سالوں میں ایک حد تک تمام مزدوروں کو یکساں مزدوری دینے کی کوشش کی گئی؛ لیکن ایک عرصہ ہوا کہ اصولاً و عملاً دونوں حیثیتوں سے (کامل مساوات کا) یہ نظریہ مسترد کر دیا گیا (پی، ٹی، چندرا، ص ۱۲۵)۔

درجے، تماشاگاہوں میں ٹکٹوں کی مختلف شرحیں اور فوجی افسروں کے خطابات کی تجدید، یہ سب چیزیں ایک مساویانہ نظامِ معیشت کے ساتھ لاگ نہیں کھاتیں۔ مساوات کا یہ تصور محض ایک بورژوا تصور ہے"[1] کہہ کر ٹالنے سے اشتراکی ضمیر کی تسکین نہیں ہوسکتی۔ سادہ طریقے پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اشتراکیت مساوات کے ہم معنی ہے۔"

(مسانی ص ۱۰۱)

اس کے بعد مسانی نے موجودہ عدم مساوات کی مختلف توجیہیں کی ہیں۔ اشتراکیت اور اشتمالیت کے باہمی فرق کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے، اس سے انھیں اتفاق نہیں، اس لئے کہ وہ اشتراکی (Socialist) ہیں اور اشتمالیوں (Communist) سے خاصہ اختلاف رکھتے ہیں۔

بہر حال اشتراکیت کے روسی علم بردار اور ان کے پیرو جو کچھ بھی کہیں، اچھے خاصے اشتراکی بھی اشتراکیت اور مساوات کو مرادف ہی مانتے آئے ہیں اور اشتراکی روس میں موجودہ معاشی تفاوت اشتراکیت کی ناکامی اور غیر فطری ہونے کا ایک بیّن ثبوت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آنہ اور پائی کی برابری مارکس کے ذہن میں نہ ہو، لیکن اونچ نیچ کا امتیاز مارکس کی باغیانہ روح کی ضد اور نقیض ہے۔ اصلیت یہ ہی جیسا کہ ہم نے کہیں اوپر بھی کہا ہے، کہ جب لینن اور اس کے رفیقوں نے مارکس کے معاشی نظریوں کو عملی جامہ پہنانا چاہا، تو انھیں کافی ترمیم کرنا پڑی۔ اسٹریچی جیسے "مومن صادق" نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے[2]۔ اور اب یہ مسئلہ "اعتراف و تسلیم" کی حد سے آگے

(بقیہ ص ۱۱۰) [3] اس بیان کے مطابق روس میں معاشی تفاوت ایک اور تینتیس کی نسبت تک پہنچ جاتا ہے۔

(حواشی ص ہذا) [1] یہ کامریڈ Molotov کا فقرہ ہے جو مسانی نے نقل کیا ہے۔

[2] اسٹریچی (ص ۳۵۵)۔

بڑھ چکا ہے۔ موجودہ روس کے سرکاری لٹریچر میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے کہ اشتراکیت ایک متحرک قوت ہے۔ اس میں ہمیشہ تجدید[1] اور نئے خون کی ضرورت ہے۔ اُن کے اعتقاد کے مطابق پہلے لینن نے تجدید کی۔ اور اب اسٹالن تجدید کر رہا ہے۔ اور اس تجدید میں ان کے نزدیک مارکس کی تعلیمات اور اشتراکیت کے بنیادی اصولوں سے انحراف بھی شامل ہے، جیسا کہ آگے ہم بیان کریں گے۔

اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اشتراکی اب تک دولت کی مساویانہ تقسیم میں ناکام رہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ "کامل معاشی مساوات" کے قائل ہی نہیں تھے اور مساوات کا یہ تصور خاص بورژوا تصور ہے (جیسا کہ اسٹالن اور اس کے حواری کہتے ہیں)، تو اس سے بڑھ کر ہمارے لئے خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور اگر وہ کامل معاشی مساوات کے نظری طور پر قائل تھے، اور اب عملی تجربوں کے بعد اس منزل پر آگئے ہیں، تو یہ اشتراکیت کی ناکامی کا کھلا اعتراف ہے۔

بہر حال موجودہ اشتراکی روس میں دولت کی مساویانہ تقسیم ہو سکی ہو یا نہ ہو سکی ہو، یہ نظامِ معیشت ہی غیر فطری، سراپا غلط اور اس لئے بے شمار مشکلات کا سبب بن سکتا ہے۔ آپ وسائل پیداوار اور ان کی تقسیم کا حق، یکسر جماعت کی ملکیت بنا دیتے ہیں۔ مگر جماعت ہی کیا چیز؟ آخر جماعت کے ارادوں اور منصوبوں کو نافذ کرنے والی کوئی انتظامی مجلس ہو گی؟ اور عملاً جماعت کو یہ کام ایک منتخب عاملہ کے حوالہ کرنا ہو گا۔ یہ مختصر منتخب عاملہ (Executive) گو شروع میں جماعت ہی کی منتخب کردہ ہو گی، لیکن جب تمام ذرائع معاش اس کے قبضہ میں ہوں گے اور عام آبادی اپنا رزق ان ہی کے ذریعہ پا سکے گی، تو اس گروہ کا پوری جماعت پر

---

[1] ملاحظہ ہو: (History of the Communist Party of Soviet Union)
(ص ۳۵۴-۳۵۳) مطبوعہ ماسکو ۱۹۴۵ء۔

حاوی ہوجانا یقینی ہے۔ یہ گروہ مُلک کے نظم ونسق اور سیاہ وسفید کا مالک ہوگا۔ کوئی منظم سے منظم طاقت اسے اقتدار کی مسند سے برطرف نہ کر سکے گی۔ اور تو اور، سرمایہ داری نظام میں تو ایک کارخانہ کے مزدور ہڑتال کر کے دوسرے کارخانوں کا دروازہ بھی کھٹکھٹا سکتے تھے، مگر یہاں تو ایک ہی بڑا سرکاری کارخانہ دار ہے، جس کی زیادتیوں اور سختیوں کی کوئی اپیل نہیں اور اس کے کارخانہ سے ہڑتال کے معنی بھوک اور موت کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس نظام کا لازمی ارتقا یہ ہے کہ تمام کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کو اکھاڑ کر ایک بڑا کارخانہ دار پوری قوم اور مُلک پر مسلّط ہو جائے اور اسی کی حکومت بھی ہو۔ ایسے استبدادی نظام میں افراد کا جو حشر ہوگا، ظاہر ہے۔ اوّلاً تو کسی فرد یا منتخب گروہ کا کُلّی اختیار پاکر دماغی توازن برقرار رکھنا ہی مشکل ہے اور خاص کر اس صورت میں کہ اوپر کسی غیبی طاقت کا خوف اور آخرت میں جوابدہی کا تصوّر بھی نہ ہو، یہ اور بھی مشکل ہے

ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے، یہ سب چیزیں موجودہ اشتراکی روس میں مشاہدے میں آچکی ہیں اور آرہی ہیں۔ پرولتاری آمریت کسی حالت میں بھی کسی دوسری آمریت سے بہتر نہیں کہی جاسکتی۔ بلکہ یہ باور کرنے کے قوی اسباب موجود ہیں کہ پرولتاری آمریت وقت کی دوسری آمریتوں (ڈکٹیٹرشپ) سے کہیں زیادہ جابر اور استبداد پسند ہے۔ ایک گروہ مُلک کے تمام وسائل معاش اور مملکت کی ساری مشینری پر قابض ہے۔ کسی کی جرأت نہیں جو اس کی کوتاہیوں پر حرف بھی رکھ سکے۔ اور کسی نے جرأت کی، تو وہ معتوب ومردود۔۔۔ اللہ جانے، کتنے بڑے لیڈر اور جرنل اسٹالن کے چشم وابرو کے اشارے پر موت کے گھاٹ اتارے جاچکے ہیں۔ جنھیں دلچسپی ہو وہ لوئی فیشر کی کتاب میں ان مظالم کی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

{ یہ اس کی کتاب (بقیہ صفحہ ۱۱۶) Stalin's Russia }

اس نظام کی دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں انسانی شخصیت کے ارتقاء کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ جمہوریت نے افراد کو شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ اس کے جواب میں اشتراکیت اور فاشستیت یا نا قسمت نے افراد کو مواد خام کی حیثیت دے رکھی ہے، جہاں انسانوں کی منصوبہ بندی (Planning) ہوتی ہے اور ایک منتخب گروہ انسانوں کو لوہے کے پرزے یا چمڑے کے جوتوں کی طرح ڈھالتا اور بناتا ہے۔ شخصیت کی تکمیل اور اس کی آزاد نشو و نما انسانی تہذیب کی اعلیٰ قدر ہے اور جو سوسائٹی اس سے محروم ہوگی، وہ مہذب اور ترقی یافتہ سوسائٹی نہیں کہی جاسکتی۔

(۱۱) **شخصی ملکیت کی منسوخی** دولت کی مساویانہ تقسیم کے ساتھ اشتراکی نظام شخصی ملکیت کو بھی مٹا دینا چاہتا ہے۔ مگر وہ شخصی ملکیت کی بھی دو قسمیں کرتے ہیں، ذرائع پیداوار میں شخصی ملکیت تو اشتراکی شریعت میں حرام ہے، لیکن افراد کے ذاتی استعمال کی چیزوں میں شخصی ملکیت روا رکھی گئی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اشتراکی روس میں ایک شہری اپنا ذاتی مکان رکھ سکتا ہے، آرام و آسائش کے سامان، موٹر اور فرنیچر وغیرہ خرید سکتا ہے، اور ایک مقرر حد تک نقد بھی رکھنے کا مجاز ہے۔ مگر وہ مکان کو کرایہ پر نہیں اٹھا سکتا، اور نہ نقد کو کسی تجارتی یا صنعتی کاروبار میں لگا سکتا ہے یہ کام حکومت کا ہے، پیداوار اور اس کی تقسیم کا سارا نظام مملکت کے ہاتھ میں ہے۔ افراد کو ان کی کارکردگی کے مطابق اُجرت دی جاتی ہے اور ضروری اشیاء فراہم کی جاتی ہیں۔

(بقیہ ص ۱۱۳) لہ Men and Politics کا ایک باب ہے جو بمبئی کے ایک ناشر نے الگ شائع کیا ہے۔ تفصیل کے لئے اس کی یہ کتاب (اصل) اور دوسری مشہور کتاب (The Great Challenge) پڑھئے۔ یہ آخری کتاب اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات اگلے باب میں آپ کی نظر سے ضرور گذریں گے۔ انشاء اللہ۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اشتراکی روس میں شخصی ملکیت قطعاً ممنوع ہے۔ مگر یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی[1]۔ ماہرین اشتراکیت اس کی تردید میں متفق اللسان ہیں۔

بہر حال ہمارے نزدیک اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ شخصیتوں کی تکمیل اور افراد کی آزاد نشو ونما کے لئے ذرائع پیداوار میں بھی شخصی ملکیت کی اجازت ہونا چاہئے، ورنہ انفرادی جد وجہد کا خاتمہ ہو جائے گا، جس پر تمام انفرادی واجتماعی کوششوں کا دارومدار ہے۔ ذرائع پیداوار کی شخصی ملکیت اور اس کے پھیلاؤ سے جو معاشی اور سماجی خرابیاں رونما ہوتی ہیں، اُن کا تدارک اور روک تھام حکومت کا کام ہے۔ اگر نظامِ حکومت صالح اور اس کے چلانے والے بھی صالح (یعنی دیانت دار، دل میں اللہ کا خوف رکھنے والے اور بنی نوع انسان کے ہمدرد) ہوں، تو پھر کوئی خرابی اور معاشی ابتری رونما نہیں ہو سکتی۔

(۱۳) اشتراکیت کا اپنے اصولوں سے انحراف

ہم نے پچھلے صفحوں میں بار بار لکھا ہے کہ مارکس کی تعلیمات اور نظریوں کو اس کے ماننے والوں نے روس میں جب عملی جامہ پہنانا چاہا تو وہ نئے حالات کے ماتحت ان لگے بندھے اور خشک اصولوں میں ترمیم پر مجبور ہوئے۔ اور جوں جوں دن گذرتے گئے، اس ترمیم اور تبدیلی میں بھی ترقی ہوتی گئی، تا آنکہ ۱۹۳۶ء کے دستور میں سوویٹ روس نے باشندوں کے بعض ایسے حق تسلیم کر لئے جن کی مذمت میں مارکس اور اس کے ماننے والے گذشتہ صدی میں ہزاروں صفحے سیاہ کر چکے ہیں۔ اس کے بعد پچھلی بڑی لڑائی کے دوران میں تو مارکس اور اشتمالیت کے اصولوں سے اشتمالیوں کا انحراف اتنا نمایاں ہو گیا کہ بڑے بڑے مومنین اشتراکیت کے قدم بھی لڑکھڑا گئے، اور وہ سوویٹ روس اور اس کے ڈکٹیٹر

---

[1] اب شخصی ملکیت میں رعایت یہاں تک پہونچ گئی ہے کہ روس میں لوگ اپنی بچائی ہوئی دولت کو بینک میں رکھ سکتے ہیں، اور اس پر انھیں سود ملتا ہے۔ نیز ترکہ اور بیمہ کی آسانیاں بھی مہیا کی جا رہی ہیں۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

سٹالن کی طرف خشمگیں نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ انحراف کی یہ پالیسی اس وقت تک جاری ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کہاں جاکر دم لے گی؟

اس سے پہلے کہ ہم ان "انحرافات اور تبدیلیوں" پر گفتگو کریں اور خود ان کے دستور اور ہم نواؤں کی مستند کتابوں سے شہادت پیش کریں، یہ واضح کر دینا مناسب ہو گا کہ ان نت نئی تبدیلیوں پر زور دینے سے ہمارا مدعا کیا ہے؟ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ انسانی عقل اپنی بے چارگی اور فطری کمزوری کی وجہ سے ایسی محدودیتوں (Limitations) میں گھری ہوئی ہے کہ وہ اپنے لئے خود زندگی کا صحیح دستور العمل — یعنی "سواء السبیل" — نہیں وضع کر سکتی۔

انسانی عقل کے ساتھ خواہشات اور جذبات کی بیماری مستقل طور پر لگی ہوئی ہے۔ جب کبھی اس نے زندگی کا دستور العمل وضع کرنے کی جرأت کی، خواہشات اور جذبات کے بہاؤ میں وہ "توسط و اعتدال کی شاہ راہ" پر نہیں قائم رہ سکتی۔ جب کبھی انسانوں نے اس کی جرأت کی، راہِ حق سے بھٹک گئے اور تباہی و گمراہی کے بیابانوں میں ٹھوکریں کھاتے رہے۔ اور آئندہ جب ایسی حماقت کریں گے، یہی حشر ہو گا۔ اشتراکیت ہو یا جمہوریت، نا تسبت ہو یا فاشیت، سب انسانی عقل کی پیداوار ہیں اور اسی لئے اعتدال و توسط کی شاہ راہ (سواء السبیل) سے ہٹی ہوئی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آئے دن ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر لیجئے۔ امریکہ اس وقت موجودہ روشن خیال دنیا کی سب سے کامیاب جمہوریت ہے۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں پوری قوم کی تائید و اتفاق سے تحریم خمر کا قانون (Prohibition Law) پاس کیا۔ اور اس کی تنفیذ میں لاکھوں کروڑوں روپے صرف کئے اور طرح طرح سے ام الخبائث کی بے شمار روحانی، اخلاقی، جسمانی اور معاشی تباہ کاریاں امریکی قوم کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ ساری کوششیں امریکی قوم کے عزم مے خواری کے آگے ناکام رہیں، اور چند برسوں کے

بعد پھر اسی جمہور کے دباؤ سے وہی نمائندے اس قانون کو منسوخ کر کے رہے (سنہ ۱۹۳۳ء)۔
عقل انسانی کی کمزوری اور اس کے فیصلے کی ناپائیداری اور تزلزل کی اس جیسی بیسیوں مثالیں معاصر تاریخ سے دی جاسکتی ہیں۔ ہم یہاں اس تفصیل میں نہیں پڑیں گے۔ ہمیں یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ چونکہ مارکسیت یا اشتمالیت ایک انسانی دماغ کی پیداوار ہے، جس نے اپنے ذاتی حالات اور ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر انسانیت کے لئے ایسا دستور العمل وضع کیا جس میں معاشیات کو اصل اور بنیاد مان کر زندگی کی تمام قدروں اور تمام شعبوں کو اس کے تابع کر دیا گیا تھا؛ جوں ہی مشکلات سے سابقہ ہوا، اس کے ماننے والوں نے اس بے لچک دستور العمل میں ترمیم کی ضرورت محسوس کی۔ اور جوں جوں تجربہ بڑھتا گیا، ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ آج تیس بتیس سال کے تجربے اور تبدیلیوں کے بعد عملی زندگی میں اُس دستور العمل (یعنی مارکس کے وضع کردہ اصول و قواعد) کی شکل اتنی بدل گئی ہے کہ اُسے اب مارکسیت یا اشتمالیت کہنا ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر موجودہ دنیا کا سب سے بڑا ہٹ دھرم انسان... (سٹالن) یہی کہے جاتا ہے کہ اصلی مارکسیت پر ہم ہی عمل پیرا ہیں؛ اور مارکسیت کی حقیقی رُوح کو کوئی صحیح سمجھا ہے، تو وہ ہم ہیں۔ {ملاحظہ ہو: کمیونسٹ پارٹی (سوویٹ روس) کی تاریخ: آخری صفحے}
بہر حال کہنا یہ ہے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت انسانی دماغ کی پیداوار تھی، اس لئے اس میں ترمیم بلکہ تحریف ناگزیر تھی۔ اٹل اور ہمہ گیر قانون تو وہ ہو سکتا ہے، جو اس کائنات کے خالق اور سارے جہاں کے پروردگار کا وضع کردہ ہو، اور جسے اس شہنشاہِ ارض وسما کے پاک باز بندوں (پیغمبروں) نے اس زندگی میں کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھایا ہو۔ امن و سلامتی اسی دستور اور قانون کے اختیار کرنے اور برتنے میں ہے۔ یہ کمزور انسان، مشرق میں ہو یا مغرب میں، روس میں ہو یا پاکستان میں، جب تک اپنی اور اپنے جیسے انسانوں کی عقل پر اعتماد

کرے گا، بھٹکتا رہے گا۔

اب آئیے، ہم آپ کو بتائیں کہ موجودہ اشتمالی روس، مارکس اور اشتمالیت کے اصولوں سے کس قدر منحرف ہو چکا ہے۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ روس کی نئی آئینی تبدیلیوں میں سے ہر تبدیلی کو ہم بُرا سمجھتے ہیں۔ ہم صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ مارکسیت کوئی ازلی و ابدی قانون نہیں ہے۔ اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ جب آج اس کے چند اصولوں میں ترمیم قبول کی جا سکتی ہے، تو کل اس کے بنیادی فلسفہ اور الحاد کی دیوار پر ہتھوڑا کیوں نہیں چلایا جا سکتا؟

۱۔ مارکسی لینینی نظریہ — اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین رہے کہ مارکس کی تعلیمات بے کم و کاست کبھی عملی جامہ پہن ہی نہیں سکیں۔ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد اشتراکیت پر عمل درآمد کے امکانات پیدا ہوئے۔ لیکن اوّل ہی روز انقلاب کے رہبرِ اعظم لینن نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ بیل یوں تو منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ اس نے اپنی ذہانت سے مارکسی فلسفہ میں ایک نئے اصول کا اضافہ کیا، جس کی آڑ لے کر مارکس کے بتائے ہوئے ناقابلِ عمل اصولوں میں مناسب ترمیم ممکن ہو۔ اس نئے اصول کا خلاصہ، موجودہ حکومتِ روس کی مستند ترین مطبوعہ[1] کتاب میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

"پارٹی کی تاریخ یہ بھی سکھاتی ہے کہ مزدور طبقہ کی ایک پارٹی اُس وقت تک اپنی طبقہ کی لیڈر نہیں ہو سکتی، جب تک کہ وہ مزدور طبقے کی تحریک کے ترقی یافتہ (Advanced) نظریے یعنی مارکسی لینینی نظریے (Marxist Leninist Theory) پر پوری طرح

---

[1] (History of the Communist Party of Soviet Union) (مطبوعہ ماسکو ۱۹۴۵ء) — اسٹیلین کے ایک تبصرہ نگار کی رائے میں اسے موجودہ سوویٹ روس کا "بائیبل" کہنا چاہئے۔

حاوی نہ ہو جائے۔

مارکسی لیننی نظریہ سوسائٹی کے ارتقاء کا مرتب علم (Science) مزدور طبقے کی تحریک کا علم، پرولتاری انقلاب کا علم، اور اشتمالی سوسائٹی کی تعمیر کا علم ہے۔ اور ایک سائنس کی حیثیت سے یہ ساکن و جامد نہیں رہ سکتا، بلکہ ترقی کرتا اور اپنے کو مکمل بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنے ارتقاء میں نئے تجربوں اور نئے علم سے اس کا مستفید اور مالامال ہونا ناگزیر ہے اور اسی طرح اس کے بعض نتیجوں اور مقدموں میں تبدیلی اور نئے حالات اور نئے تاریخی ماحول کے مطابق نئے نتیجوں اور نئے فیصلوں سے ان کا بدلنا ضروری ہے۔

مارکسی لیننی نظریئے میں مہارت کے معنی ہیں "نظریہ کو انقلابی تحریک کے نئے تجربوں سے مالامال کرنا، نتیجوں اور نئے مقدموں کا اضافہ کرنا"۔ اس کے معنی ہیں نظریئے کو ترقی دینا اور آگے بڑھانا۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اس کے ان مقدموں اور نتیجوں کو جو پرانے اور دقیانوسی (Antiquated) ہو چکے ہیں، تاریخ کے نئے حالات کے مطابق نئے نتیجوں اور مقدموں سے بدلنے میں بالکل جھجک نہ ہو، بشرطیکہ نظریہ کے جوہر سے مناسبت کا خیال نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

مارکسی لیننی نظریہ کوئی مذہبی عقیدہ (Dogma) نہیں، بلکہ یہ عملی میدان کا رہبر ہے"۔

یہ نظریۂ ارتقا ایجاد تو لینن نے کیا تھا، لیکن مندرجہ بالا تشریح اس کے حواریوں نے کی ہے اور انھوں نے اس طرزِ فکر کا نام بھی "مارکسیت" کی بجائے "مارکسی لیننی نظریہ" رکھ دیا، تاکہ مارکس کی کتابوں سے ان کی پالیسی اور طرزِ عمل کے متعلق کوئی شہادت نہ لی جائے۔ یہ تشریح لینن کے

حواریوں اور شاگردوں نے اس انداز میں اس لئے کی ہے تاکہ وہ اپنی مخالف اشتراکیت کارروائیوں کے لئے وجہ جواز پیدا کر سکیں۔ لینن نے تو صرف بسم اللہ کی تھی، اسٹالن نے اس انحراف اور "تجدید" کی تکمیل کی، جیسا کہ آگے بیان ہو گا۔

ب۔ عالمگیر انقلاب بہرحال 'مارکسیت' کے اصولوں کے ناقابل عمل ہونے کا یہ پہلا اعتراف تھا۔ اس کے بعد ترمیم اور تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی "سرکاری تاریخ" (یعنی اسی حکومت کی مرتب کردہ کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے) کی زبان میں سنئے:

"۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے تمام دنیا کے مارکسی (Marxist) یہ سمجھتے تھے کہ سرمایہ داری نظام اور اشتراکی نظام کے درمیانی انتقالی دور کے لئے بہترین نظام 'پارلیمانی جمہوری پبلک' نظام حکومت ہے۔ اینجلز کی ایک تصریح کی وجہ سے بھی تمام اشتراکیوں کا خیال تھا اور خود لینن بھی اسی کا قائل تھا۔ لیکن روسی انقلاب کے تجربے کے بعد لینن نے ایک دوسرا نظریہ پیش کیا۔ مارکسیت کی بنیادی روح کے مطابق وہ اس نتیجہ پہ پہنچا کہ پرولتاری طبقہ کی آمریت کے لئے بہترین طریق حکومت 'پارلیمانی جمہوری ری پبلک' نہیں، بلکہ اس کے مزاج سے ہم آہنگ نظام سوویٹ ری پبلک ہے" — اس پر تمام دنیا کے ابن الوقت اشتراکیوں نے لینن پر مارکس کی تعلیم سے انحراف کا الزام عائد کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف لینن ہی صحیح معنوں میں مارکسیت کا علم بردار اور اس کی روح کا سچا ترجمان تھا۔ لینن، مارکسی نظرئے کو نئے تجربوں سے مالامال کر رہا تھا۔ اور یہ "ابن الوقت" اُسے ایک مذہبی عقیدہ بنا کر پیچھے ڈھکیل رہے تھے"

(ص ۳۵۶ ـ ملخص)

غور کیجئے۔ اسٹالن کی پارٹی مارکس کے اصلی ماننے والوں کو "ابن الوقت" (Opportunist) کہہ رہی ہے۔ یہ پہلی اہم ترمیم تھی۔ دوسری نمایاں تبدیلی بلکہ انحراف کا حال بھی سرکاری زبان ہی سے سُننا مناسب ہوگا :-

"پُرانے سرمایہ داری نظام کے مطالعہ کے بعد مارکس اور اینجلز اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ اشتراکی انقلاب صرف ایک مُلک میں کامیاب نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ انقلاب صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتا ہے، جب تمام یا اکثر مُلکوں میں یکبارگی ہلّہ بول دیا جائے۔ بعد میں یہ خیال تمام مارکسیوں کا بنیادی اصول بن گیا۔ لیکن بیسویں صدی کے نئے حالات کے مطالعہ کے بعد لینن اس نتیجہ پر پہنچا کہ مارکس اور اینجلز کا فارمولا موجودہ حالات میں نئے تاریخی حالات سے لاگ نہیں کھاتا، اور اب صرف ایک مُلک میں اشتراکی انقلاب بخوبی کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس پر بھی تمام مُلکوں کے ابن الوقتوں نے بڑی لے دے کی۔ مگر سچا مارکسی اور مارکسیت کی روح کا حقیقی ترجمان صرف لینن ہی تھا" (ص ۳۵، ملخص)

یہ ابن الوقت کا بار بار تکرار قابلِ غور ہے۔ اسٹالن اور اس کا جرگہ اپنی کمزوری کو سمجھتا ہے۔ اس لئے اس قسم کا پروپگنڈا کئے بغیر اندر یا باہر کہیں بھی اس کی ساکھ نہیں قائم ہو سکتی۔ یاد رہے کہ یہ سرکاری تاریخ ٹکسٹ بک کے طور پر ہر اسکول اور ہر لائبریری میں ہر ہر فرد کو پڑھائی جاتی ہے۔

اس انحراف کی توجیہ اور مارکسیت کے اصولوں کی روشنی میں ان انحرافات پر تنقید کرنے والوں کو "ابن الوقت" کہنے کی توضیح بھی ملاحظہ ہو :-

"ابن الوقتی اور مصلحت پرستی (Opportunism) ہمیشہ مارکسی نظریہ یا اس کے کسی اصول کے انکار ہی سے نہیں ظاہر ہوتی۔ اُبن الوقتی بسا اوقات مارکسیت

کے ایسے نظریوں کا سہارا لیتی ہے جو نئے حالات میں از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ یہ اِبن الوقتی ان نظریوں کو مذہبی عقیدہ بنا کر 'مارکسیت' کے ارتقا کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے اور اس طرح پرولتاری طبقے کی انقلابی تحریک کی ترقی میں حائل ہوتی ہے" (ص ۵۰ ۔ ۳۰۷)

یہ قیمت ہے خداوندانِ روس کی نگاہ میں مارکس کے سچے پیروؤں کی۔ اب ذرا "اپنے منہ میاں مٹھو" کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

"بلا کسی مبالغہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اینجلز کی موت کے بعد ماہر نظریہ ساز (Master Theoretician) لینن اور لینن کے بعد اسٹالن اور لینن کے دوسرے چیلے ہی ایسے 'مارکسی' ہیں، جنھوں نے مارکسی نظریہ کو ترقی دی اور پرولتاریہ کے طبقاتی جدوجہد میں نئے تجربے حاصل کر کے اُسے مالامال کیا۔

اور چونکہ لینن اور لینینیوں نے مارکسی نظریے کو ترقی دی، لینینیت 'مارکسیت' ہی کی ایک ارتقائی صورت ہے۔" (ص ۳۵۸)

ان اقتباسات سے یہ بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مارکس کی تعلیمات بے کم و کاست اپنی اصلی صورت میں کبھی عملی جامہ نہیں پہن سکیں۔ اوّل روز ہی سے اُن میں کتر بیونت شروع ہو گئی اور وہ بھی خود اس کے ترجمان لینن کے ہاتھوں۔

ابھی آپ نے پڑھا کہ لینن کے خیال میں صرف ایک ملک میں بھی انقلاب کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود عام بالشویک یہ خیال کرتے تھے کہ جب تک ہمسایہ ملکوں میں پرولتاری انقلاب اور طبقاتی تصادم رُونما نہ ہو، روس میں اشتراکیت کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔ مگر جب دنیا کے دوسرے صنعتی مُلکوں میں یہ توقعات پوری نہ ہوئیں، تو اسٹالن نے صاف صاف کہنا شروع کیا کہ اُشتراکیت' صرف ایک مُلک میں کامیابی کر سکتی

چل سکتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ عالمگیر انقلاب کا نظریہ ہی گویا ان لوگوں نے ترک کر دیا۔ اور اب روسی اثرات کے ماتحت دوسرے ملکوں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سامراج اور امپیریلیزم کے کھیل ہیں، پرولتاری انقلاب کا جذبہ نہیں۔ ٹراٹسکی کو اسٹالن سے بڑا اختلاف اسی باب میں تھا۔ وہ مارکسی نظریئے کے مطابق دنیا کے تمام ملکوں میں پرولتاری انقلاب کے بڑھانے اور پھیلانے کا قائل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ صرف ایک ملک میں اشتراکیت کو کامیابی کے ساتھ چلانا اور قائم رکھنا ناممکن ہے[۱۹]" لیکن موجودہ روس میں ٹراٹسکی جیسے اشتراکیت اور مارکسیت کے مومن قانت کی نہ چل سکی۔ اور آخر مکسیکو میں جلاوطنی[۲۰] کے عالم میں ایک اشتراکی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ (۱۹۴۰ء)

ج۔ قومیت اور نسل پرستی ایک ملک میں انقلاب کی کامیابی کے نظریے پر قناعت کے بعد قومیت کا جذبہ طبعی طور پر نشو و نما پانے لگا۔ ۱۹۳۵ء تک یہ رفتار دھیمی تھی۔ اس کے بعد روسی قوم پرستی کا جذبہ دن بدن ترقی کرنے لگا۔ اور صرف قوم پرستی نہیں، بلکہ نسل پرستی بھی شروع ہو گئی۔

بالشوزم یا اشتمالیت تو ایک بین الاقوامی تحریک تھی۔ لینن کے زمانے میں ایک ملک میں انقلاب کے نظریے پر قناعت کے باوجود بین الاقوامی رجحان نمایاں تھا۔ ۱۹۲۱ء میں لینن نے پولینڈ کو اس کے مطالبے سے زیادہ علاقہ دے دیا۔ اس نے فن لینڈ اور دوسری بالطی (Baltic) ریاستوں کی آزادی خوشی سے تسلیم کی۔ افغانستان کے ساتھ

---

[۱۹] Webbs کی مشہور کتاب (صفحہ ۱۱۵۷)۔ [۲۰] ۱۹۲۹ء میں یہ جلاوطن کیا گیا۔ مارکسیت کی تعبیر و تشریح میں اُسے سٹالن سے اختلاف تھا۔ اس کے سوا اس کا اور کوئی قصور نہیں تھا۔ بقول لوئی فیشر کے: "سٹالن بحث و استدلال میں تو ٹراٹسکی کو زیر نہ کر سکتا تھا۔ البتہ اس کی گرفتاری پر قادر تھا، وہ اُس نے کر دکھایا۔" (The Great Challenge صفحہ ۲۵۶)

بھی مراعات برتی۔ ایران کو اس کے غصب کردہ حقوق واپس کر دیے۔ ترکی کو دوست بنایا۔ سلاوی نسل پرستی اور اتحاد سلاوی کی کوئی تحریک اس کے ذہن میں نہیں تھی۔ خلاصہ یہ کہ وہ انقلاب کو کامیاب بنا رہا تھا۔ شہنشاہیت کی تشکیل اس کے سامنے نہیں تھی (لوئی فیشر ص ۲۳۷)۔

لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد یہ حالت نہیں قائم رہی۔ مشہور امریکی مبصر لوئی فیشر، جو ایک مدت تک سوویٹ روس میں رہ چکا ہے اور خود بھی اشتراکی خیالات رکھتا ہے۔ اسپین کی خانہ جنگی میں اشتراکیوں کی طرف سے باضابطہ جنگ میں شریک بھی ہو چکا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"نسلی برتری یا قومی تفوق کا جذبہ ۱۹۳۵ء تک سوویٹ فکر میں راہ نہیں پا سکا تھا۔ لیکن اس کے بعد سوویٹ حکومت نے اس جذبے کو تیزی کے ساتھ ہوا دی۔ اور نہ صرف روسی قومیت بلکہ یوکرینی قومیت اور سلاوی نسلیت کے تخیل کو بھی غذا دینے کی کوشش کی۔ نسل اور خون پر زور دینا اشتمالیت، بالشویت اشتراکیت کی بنیادی تعلیمات اور لینن کی حکمت عملی کی بالکل نقیض ہے۔ یہ ایک رجعت پسندانہ اقدام ہے۔" (ص ۲۳۱)

اب اس جذبے کی نمود بھی ملاحظہ ہو:۔

۲۴ مئی ۱۹۴۵ء کو سٹالن نے ایک ڈنر کے موقع پر روسی قوم کی سلامتی کا جام پیا۔ "اس لئے کہ وہ سوویٹ روس کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ نمایاں قوم ہے۔ میں روسی قوم کا جام صحت اس لئے پی رہا ہوں کہ اس نے اس لڑائی میں سوویٹ روس کی تمام قوموں میں اپنے کو زیادہ نمایاں اور سب سے افضل ثابت کر دکھایا ہے۔"

اس پر لوئی فیشر لکھتا ہے:۔

"یہ جام صحت آج سے آٹھ دس برس پہلے ناممکن ہوتا۔ سوویٹ یونین کی ایک قوم کو دوسری قوموں پر فوقیت دینا بالشویکوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہوتا۔ سوویٹ یونین

ہیں تمام قومیتیں برابر تھیں۔ نہ کوئی تابع، نہ کوئی متبوع۔

روس آج روس نہیں، بلکہ سوویٹ یونین ہے۔ روس کا لفظ تو ہم صرف آسانی کے خیال سے استعمال کرتے ہیں۔ روسی اسوویٹ روس کی کُل آبادی کا صرف ۵۸ فی صد ہیں۔ آج یہ روسی قوم سوویٹ یونین میں سب سے نمایاں قوم ہے ـــــ بالشویک انقلاب کی یہ سب سے نمایاں تبدیلی ہے۔ اس سے سوویٹ نظام کی پوری ساخت ہی بدل جاتی ہے۔ اب وہاں روسی قومیت سے سلاوی نسل پرستی کی طرف تدریجی ارتقا ہو رہا ہے۔" (ص ۲۳۱-۲، ملخص)

سوویٹ روس میں جذبہ قوم پرستی کی روز افزوں ترقی اب کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہی، جس پر مزید دلیل لانے کی ضرورت ہو۔ پچھلی بڑی لڑائی کے دوران میں بالشویکوں نے مُلک کی مدافعت کے لئے اپنی قوم سے اشتراکیت کے نام پر اپیل نہیں کی، بلکہ اُن کا سارا زور حبّ الوطنی کے جذبے پر تھا۔ کبھی اشتراکیت یا اشتمالیت کے بچاؤ کے لئے نعرۂ جنگ بلند نہیں کیا گیا۔ جب کہا گیا تو وطن (Father land) کے تحفظ کے نام پر۔ اور تو اور سوویٹ یونین کی اشتمالی پارٹی کی سرکاری تاریخ میں "ہمارا ملک" (Our Country) کا فقرہ بے جھجک استعمال کیا گیا ہے۔ (ص ۹۴)

ان واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اشتراکی روس کا بین الاقوامی تصور اس کی ہمسایہ مغربی قوموں کو بالکل متاثر نہ کر سکا، بلکہ وہ خود اُلٹا ان ملکوں کے جذبہ نسل پرستی اور قوم پرستی سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اپنے بنیادی اصولوں کے پس پشت ڈالنے میں بھی اسے جھجک نہیں معلوم ہوتی۔

د۔ امپیریلزم | لوئی فیشر نے کیا خوب لکھا ہے:-

"جان دار اور متحرک قوم پرستی غذا چاہتی ہے، اور قومیت کی غذا اتنی زمین اور نیا خطۂ ارض ہے۔"

قوم پرستی کے نشوونما کے ساتھ مُلک گیری کا جذبہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ اس باب میں کسی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ۱۹۴۵ء سے کچھ پہلے اور بعد کے واقعات پر نظر ڈالئے۔ واضح ہو جائے گا کہ کس طرح روس پر امپیریلزم کا نشہ سوار ہوتا جا رہا ہے۔ ایران میں جو کچھ ہوا، وہ ہر شخص جانتا ہے۔ ترکی سے جو مطالبات وہ کر رہا ہے، زار روس نے بھی اس سے زیادہ نہیں کیا تھا۔ طرابلس الغرب کا مطالبہ تو حد درجہ شرمناک تھا۔ مشرقی یورپ کو جس طرح اس نے اپنے دام میں لیا ہے، وہ کسی سامراجی حکومت کے شایانِ شان تو ہو سکتا ہے۔ مگر مزدوروں اور بے کسوں کی ہمدردی اور مظلومیت کی غم گساری کا دم بھرنے والوں کو تو یہ زمین کی بھوک زیب نہیں دیتی۔

آپ انقلابی روس اور موجودہ سامراجی روس کے طرزِ عمل اور حکمت عملی کا فرق اس سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد بالشویکوں نے اپنی عام اپیل میں اس بات پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ مفتوحہ ملکوں سے تاوانِ جنگ ہرگز نہ وصول کیا جائے۔ لیکن پچھلی لڑائی میں فتح کے نشے نے اشتراکیوں کو اتنا مدہوش کر دیا کہ وہ اپنا اصول اور اپنی پہلی حکمت عملی بھی فراموش کر گئے اور شکست خوردہ ملکوں سے بھاری تاوانِ جنگ وصول کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(Dynamic Nationalism needs food, and the food nationalism is territory)

(The Great Challeuge)

اس لڑائی کے بعد سوویٹ روس نے اپنی شہنشاہیت کا جو جال پھیلانا شروع کیا ہے اس پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے (ص ۳۲-۳۱) لوئی فیشر لکھتا ہے :-

"جون ۱۹۳۶ء میں اسٹالن نے یہ اعلان کیا" ہم کسی دوسرے ملک کا ایک انچ بھی نہیں چاہتے۔ لیکن اپنے مُلک کا ایک بالشت چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔" یہ سوویٹ روس کی خارجی پالیسی کا نصب العین رہا ہے۔ اسٹالن نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم مشرقی پولینڈ یا بالٹک ریاستوں اور فن لینڈ کے ایک حصے کے سوا دوسرے ملکوں کا ایک انچ بھی نہیں لینا چاہتے۔ اس نے بلا کسی استثناء کے عام اور واضح اعلان کیا تھا۔ اسٹالن کے ہوا خواہ اب فیصلہ کریں : کیا وہ واقعی اس اصول کا قائل تھا؟ یا اس نے یہ پالیسی ۱۹۳۶ء کے لئے بنائی تھی، جب روس دوسروں پر جور و تعدی کے قابل نہیں تھا۔ اور ۱۹۳۹ء میں یہ اصول ترک کر دیا، جب اس نے یہ محسوس کیا کہ اب روس دوسرے ملکوں پر غاصبانہ قبضہ کر سکتا ہے (ص ۳۵-۳۴)

روس کے ان سامراجی ہتھکنڈوں نے اس کے بڑے بڑے ثنا خوانوں کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ مسٹر مسانی (جن کی "ثنا خوانی" کے نمونے اوپر گذر چکے ہیں) نے پولینڈ کے معاملے پر ۱۹۴۴ء میں کہا تھا :

"سٹالن کا یہ کہنا کہ "روس اور پولینڈ کا معاملہ ایک نجی معاملہ ہے، جس میں امریکہ کو دخل دینے کی ضرورت نہیں" بالکل ویسا ہی ہے، جیسے ہماری سرکار (برطانیہ) کہا کرتی ہو کہ برطانیہ اور ہندوستان کا مسئلہ ایک نجی مسئلہ ہے"۔[1]

روس کی سامراجی ذہنیت اور مُلک گیری کی ہوس کا اندازہ فن لینڈ کے معاملہ سے

[1] امرت بازار پتریکا، کلکتہ : مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۴۴ء۔

بھی ہو سکتا ہے۔ فن لینڈ کے ساتھ اس کا صلح و آشتی کا معاہدہ تھا، جس کو توڑنے کے لئے قانونی طور پر چھ ماہ پہلے نوٹس دینے کی ضرورت تھی۔ لیکن اس نے عین حملے سے صرف ۲۴ گھنٹے پہلے اس کی منسوخی کا اعلان کیا (۱۹۳۹ء)۔

قوم پرستی اور امپیریلزم ایک ہی جذبے کے شاخسانے ہیں۔ لوئی فیشر موجودہ روس کے قومی اور سامراجی رجحانات پر اپنے مخصوص انداز میں لکھتا ہے:۔

روس "ایک ملک میں اشتراکیت" کے نظریے اور اس اندرونی تضاد میں پھنس کر رہ گیا ہے، جو اس نظریے کے اندر چھپا ہوا ہے۔ سٹالن نے اس بحران سے نکلنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۶ء کا دستور مرتب کر کے اس جمہوریت کو رواج دینا چاہا۔ لیکن یہ کوشش ناکام رہی، چونکہ وہ ڈکٹیٹر شپ اور خفیہ پولیس کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سٹالن کی ڈکٹیٹر شپ کے بعد سے دن بدن جمہوریت تنزل ہی پر ہے۔ شاید سٹالن خیال کرتا ہو، کہ سوویٹ یونین کے حدود کو بڑھا کر اور نئے علاقوں کو اس کے دائرۂ اثر میں لا کر وہ ملک کو بین الاقوامیت کی طرف لے جا رہا ہے۔ لیکن چھوٹے ملکوں پر غاصبانہ تسلط، مجلس اقوام متحدہ میں ویٹو کے حق پر اصرار اور تین بڑی مملکتوں کے غلبہ و اقتدار کی تائید، یہ چیزیں بین الاقوامیت کی طرف نہیں لے جاتیں۔ یہ برتر قومیت اور جذبۂ قوم پرستی بلکہ سامراجی نقطۂ نگاہ کی غمازی کرتی ہیں۔

بین الاقوامیت اور جمہوریت، قومی ڈکٹیٹر شپ کے دائرۂ نفوذ میں نہیں فروغ پا سکتیں۔ اس لئے اشتراکیت سٹالن کے زیر اقتدار نہیں زندہ رہ سکتی۔ روس کی اشتراکیت کا صرف نام ہی نام رہ گیا ہے۔ اُسے ایک بے رُوح جسم کہہ سکتے ہیں۔"

(ص ۱-۲۶۰)

یہ امریکی اہل قلم (روئی فیشر) چودہ برس روس میں رہا۔ اسے "اشتراکیت" سے بڑی محبت ہے۔ اس نے اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر دی تھی۔ اسٹالن کے دور میں اس کے اشتراکی ضمیر کو دھچکا لگا۔ اور جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، تو اسٹالینی دجل کا پردہ چاک کرنے کے لئے اس نے اپنی قلم اٹھالی۔ یہ ساری داستان وہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ بیان کرتا ہے انگلستان کے مشہور معاشی عالم پروفیسر لسکی (ہمارے ملک کے متعدد اشتراکیوں کو جن کی شاگردی کا فخر حاصل ہے) کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہے:۔

"سوویٹ یونین کے متعلق میں نے اپنا رویہ کیوں بدلا؟

مجھ میں اس لئے تبدیلی پیدا ہوئی کہ خود روس بدل گیا۔ میرے اختلاف کی کوئی ذاتی یا خانگی یا کاروباری وجہ نہیں۔ دراصل یہ روس کی نئی پالیسی اور نئے حالات کا ردِ فعل ہے۔ میرا یہ ردِ فعل قوم پرستی پلاٹی کے ممبروں کا وحشیانہ اخراج، روز افزوں معاشی و معاشرتی عدم مساوات اور نئے حکمراں طبقے کے خلاف ہے۔ میرا بڑا اختلاف سوویٹ گورنمنٹ کی قومی، سامراجی اور غیر جمہوری حکمت عملی سے ہے۔ خاص طور پر میں روس کی نئی قوم پرستی کا مخالف ہوں۔ ماسکو کی بین الاقوامیت، میرے لئے سب سے بڑی کشش کی چیز تھی۔ میری زندگی کے چودہ سال روس میں گذرے، اس پوری مدت میں مجھے کبھی روس کے درختوں، زمین اور پتھروں کے مجموعہ سے دلچسپی نہیں ہوئی۔ میری توکشش ان نئی اور شاندار تبدیلیوں میں تھی، جو روس میں نمودار ہو رہی تھیں اور جو میرے خیال میں اس قوم کے علاوہ دوسری قوموں کے لئے بھی مفید ہو سکتی تھیں۔ سب سے زیادہ مجھے سوویٹ بین الاقوامیت کے ارتقا سے دلچسپی تھی، اس لئے کہ قوم پرستی کا جذبہ میرے نزدیک بدترین لعنت، انسانیت کے لئے عذاب عظیم اور لڑائیوں کا بڑا سبب ہے

ماسکو کا قوم پرستی کو اپنا شعار بنا لینا میری زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

تو کہا اب اس اختلاف کی صورت میں اپنی زبان نہ کھولوں؟ یہ آخر کیوں؟؟۔

تنقید سے بیزاری کلیت پسند (Totalitarianism) نظام کی

کی خصوصیت ہے۔ اور جمہوریت؟ جمہوریت تو نام ہی تنقید کا ہے۔" (ص ۹-۲۶۸)

۸۔ **استبداد** | قوم پرستی کے نشو و نما اور مُلک گیری کی ہوس کے ساتھ ساتھ اندرونی استبداد میں بھی روس نے خاصی ترقی کی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جن انقلابیوں نے مارکس اور اشتمالیت کے نام پر قربانیاں دیں اور طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں، جب اُن کی آنکھوں کے سامنے انقلاب کی گاڑی پیچھے کو دھکیلی جانے لگی، تو فطری طور پر ان میں بغاوت اور نفرت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ دوسری طرف اسٹالن یہ سمجھ چکا تھا کہ وہ اپنی من مانی کارروائیاں "فولادی ہاتھ" سے کام لئے بغیر نہیں پوری کر سکتا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں پھانسی کے تختوں پر لٹکائے گئے۔ بے شمار بے گناہوں کو معمولی شبہوں پر سائبیریا کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ موجودہ نظام اور اس کی پالیسی کے خلاف 'تصور' بھی دماغ میں لانا سزا کا باعث ہونے لگا۔ سی، آئی، ڈی، سایہ کی طرح ساتھ رہنے لگی۔ اور تو اور خود اسٹالن کے مقربین میں بھی خفیہ پولیس کے 'سایہ' سے نہیں بچ سکتے۔ غیر ملکیوں کے ساتھ میل جول کی باشندوں کو بالکل اجازت نہیں۔ کسی مُلک میں سفیروں اور اُن کے عملہ کو اتنی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی جتنی ماسکو میں دوسرے مُلکوں کے سفیروں اور ان کے عملہ کو —

— یہ سب باتیں راقم اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہے۔ روس کے حامی اور مخالف دونوں اس باب میں متفق ہیں۔ ابھی پچھلے برس ہندوستانی سفارت خانہ (ماسکو) کے ایک رکن پریم بھاٹیا نے "روس میں چار مہینے" کے عنوان سے ایک مقالہ چھ نمبروں میں لکھا تھا،

[illegible]

جس سے وہاں کے اندرونی حالات پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور ہمارے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ حالانکہ مضمون نگار موجودہ روس کا مدّاح معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک امریکی پروفیسر کے سلسلۂ مضامین[1] کا ذکر اوپر آچکا ہے جو اس نے موجودہ روس کے متعلق سپردِ قلم کیا ہے۔ مضمون نگار کئی سال تک روس میں رہ چکا ہے اور سیاسیات و بین الاقوامی معاملات کا عالم ہے۔ اس لئے اس کا بیان اہمیت کا مستحق ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"بعض ایسی چیزوں پر سزا دینا، جو ہمارے نزدیک بے ضرر ہیں (جیسے غیر ملکی سیاست کاروں سے ملنا جلنا) سوویٹ نظام کا جزو رہا ہے۔ اس قسم کے سماجی معاملات کو جرم سمجھنا اور ان کی سزا دینے میں طرح طرح کے طریقے ایجاد کرنا سوویٹ حکومت کا ایسا فعل ہے جو انسانی حقوق کے امریکی تصور کو بُری طرح مجروح کرتا ہے۔ مجرموں اور خاص کر سیاسی مخالفوں کے ساتھ سوویٹ حکومت کا برتاؤ ایک طرح خود اپنی قوم کے خلاف اعلان جنگ کے مرادف ہے۔ سوویٹ زندگی کا یہ رُخ بھی جنگ کے بعد زیادہ خراب اور شر انگیز ہو گیا ہے[2]۔"

خفیہ پولیس کی ہمہ گیری کے متعلق یہ امریکی پروفیسر اپنے تاثرات کی ابتدا اس طرح کرتا ہے:۔

ایک چیز جو سوویٹ روس میں حاکم طبقہ اور عام پبلک پر یکساں چھائی ہوئی ہے، وہ ہے خوف۔ خوف دوسرے ملکوں سے لڑائی چھڑ جانے کا اور خفیہ پولیس کا۔ اس سے شاید اسٹالن ہی

(باقی حاشیہ نمبر ۱ ص ۱۳۰) لہ (Four Months in Russia)

(اسٹیٹسمین۔ مورخہ ۱۹ اکتوبر – ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۸ء) لہ (Notes on Life and

(سول اینڈ ملٹری گزٹ ۲۱، ۲۳، ۳۰ نومبر، ۷، ۱۴، ۲۱ دسمبر ۱۹۴۸ء Travels in Russia)

[2] سول اینڈ ملٹری گزٹ: مورخہ، دسمبر ۱۹۴۸ء۔

مکمل طور پر آزاد ہو۔ البتہ خوف کی اس عمومیت کی ایک تشریح ضروری ہے، اور وہ یہ کہ سویٹ نظامِ حکومت میں ایک شخص جوں جوں اختیار کے منصب پر بلند ہوتا جاتا ہے، اس کا یہ خوف بھی بڑھتا جاتا ہے، تاآنکہ وہ ان گنے چنے آدمیوں میں نہ پہونچ جائے جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں اسٹالن کا کچھ اعتماد حاصل ہے[۵۲]"

لوئی فیشر نے بھی اپنی کتاب میں موجودہ روس کے جور و استبداد کی بڑی تفصیل کی ہے افسوس کہ موقع طوالت کا نہیں۔ یہاں ہم فیشر کی کتاب کے صرف ایک آدھ اقتباس دینے پر اکتفا کریں گے۔

ان بغاوت کے مقدموں کا ذکر کرتا ہوا، جو اسٹالن نے اپنے ممکن حریفوں کو ختم کرنے کے لئے دائر کئے تھے، لکھتا ہے:۔

"ماسکو کے مقدمے ۱۹۳۶ء، ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں وقوع پذیر ہوئے۔ لیکن سویٹ تاریخ کے یہ انتہائی نازک ابواب تھے اور یہ سرتاسر اسٹالن کی کارستانی تھی۔ کرملن (روس کا مرکزی قصرِ حکومت) کو توقع ہے کہ دنیا کی رائے عامہ اُن مقدموں کو جعلی سمجھنے کی جگہ صحیح تسلیم کرلے گی۔ اسی لئے ان مقدموں پر بحث و مباحثہ اب تک جاری ہے۔

آج سویٹ خفیہ پولیس چوٹی کے سویٹ لیڈروں پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ یہ اُن کی نقل و حرکت، ڈاک، اور ٹیلیفون کی گفتگو پر بھی احتساب کرتی ہے (ص ۵۹)۔

(ان مقدمات سے الگ) اکثر بالشویک لیڈر بلا مقدمہ چلائے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دئے گئے۔ پچاس سے کم آدمیوں پر ماسکو میں مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن ہزاروں نے اقرارِ جرم نہیں کیا اور انھیں سزا بھگتنا پڑی" (ص ۶۱)

[۵۲] سول، مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۴۸ء۔

موجودہ روس کا سارا نظام جھوٹ اور فریب پر ہے :-

"تمام آمریتوں (Dictatorship) کا سب سے چلتا ہوا حربہ سفید جھوٹ ہے (ص ۶۱)"

"ان کھلے مقدموں کے علاوہ، سُرخ فوج کے افسرِ اعلیٰ مارشل تخاشوسکی (Tukhachevsky) اور سات دوسرے بڑے فوجی افسروں کا کورٹ مارشل ہوا۔ یہ ۱۱ جون ۱۹۳۷ء کو خفیہ طور پر منعقد ہوا۔ اور ماسکو کے مقدموں میں یہ سب سے اہم مقدمہ تھا ــــ اس مقدمہ کے متعلق معلومات بالکل صیغۂ راز میں ہیں۔ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مقدمہ بھی نہیں چلایا گیا (ص ۶۱)"

ان مقدموں کی مدافعت اور اس دار و گیر کے جواز میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اس پر بحث کرنے کے بعد آخر میں لوئی فیشر کیا خوب لکھتا ہے :-

"...... یہ مقدمے دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو اسیران بلا بے گناہ تھے، تو گویا یہ دار و گیر اور پارٹی سے اخراج اور جلا وطنی ــــ سب کی سب اپنے حریفوں کو میدان سے ہٹانے کی ایک چال تھی۔ اور اگر وہ مجرم تھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ سوویٹ کلیت پسند نظام کی بعض خرابیوں نے اسٹالن کے سوا ان تمام ممتاز لوگوں کو انقلاب اور مُلک کا باغی بنا دیا، جو سوویٹ انقلاب کے بانی اور دل و دماغ تھے۔ دونوں میں سے کوئی صورت سوویٹ نظام کے لئے خوش آئند نہیں ہو سکتی"

(ص ۶۴)

ایک اور جگہ سٹالن کی ڈکٹیٹر شپ کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"سٹالن کے روس میں ہر اچھائی اور بُرائی اوپر سے آتی ہے۔ فیصلے عموماً ڈکٹیٹر شپ کے

بلند اور عظیم الشان منارے پر ہوتے ہیں اور اس کے بعد عام طبقوں تک احکام بھیجے جاتے ہیں، جہاں حسب عادت اور بے چون وچرا اطاعت کے جذبے کے ماتحت اُن کی خود بخود تعمیل ہو جاتی ہے۔ ایک ایسے نظام میں، جو اس اصول پر قائم ہو کہ مقصد کی پاکیزگی ذرائع کو بھی پاکیزہ بنا دیتی ہے (خواہ وہ کیسے ہی ہوں) ذرائع اپنی تادیبی اور اخلاقی قدر کھو دیتے ہیں، بلکہ بداخلاقی اور سیاسی ناکارہ پن کا سبب بن جاتے ہیں (ص ۱۳۴)

اب ہم اس سلسلے کو وب صاحبان (Webbs) کے ایک اقتباس پر ختم کرتے ہیں۔ یہ میاں بیوی سویٹ روس کے موجودہ نظام کے بڑے مداح ہیں اور ان کی کتاب (جو باریک ٹائپ کے ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے) اپنے موضوع (یعنی سویٹ روس کی تاریخ) پر نہایت مستند شمار کی جاتی ہے۔ ماسکو بغاوت کے مقدموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"...... جب ہم نے اس کتاب (Soviet Communism) کا دوسرا اڈیشن ۱۹۳۷ء میں شائع کیا، تو اس وقت سویٹ یونین کے نقادوں کی نگاہ میں سب سے بڑا شرمناک واقعہ (Scandal) یہی بغاوت[1] کے مقدمے تھے۔ یہ مقدمے ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ہوئے۔ نہ صرف لینن کے پرانے بالشویک رفیق اور اسٹالن کی بعد کی پالیسی کے مخالف، بلکہ سرخ فوج کے بہترین

---

[1] یہاں پر Webbs نے حاشیہ میں امریکی سفیر مسٹر Davies کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں اس نے مقدموں اور سزاؤں کو سراہا ہے۔ لوئی فیشر نے اپنی کتاب میں امریکی سفیر کی خوب قلعی کھولی ہے اور اسرار درون پردہ کو بے نقاب کیا ہے۔ جنھیں دلچسپی ہو وہ لوئی فیشر کی کتاب ضرور پڑھیں۔

افسر بھی اس لپیٹ میں آگئے .... میرے خیال میں ان پر غیروں سے سازباز کا جرم ثابت ہوگیا تھا۔ ان سازشوں میں سب سے اہم ٹراٹسکی کی تحریک تھی، وہ ایک مُلک میں اشتراکیت کی تعمیر کو ناممکن سمجھ کر اس بات پر مصر تھا کہ بالشویک پارٹی کو مارکس اور لینن کی پالیسی پر جما رہنا چاہیے، یعنی تمام دنیا میں پرولتاری انقلاب کی حوصلہ افزائی اور اس کو ہوا دینے کی پالیسی۔ (ص ۱۷۰-۷۱)"

"یہ مانتے ہیں کہ ٹراٹسکی مارکس کے اصولوں پہ جما ہوا تھا اور سٹالن سے اس کا اختلاف صرف اسی وجہ سے تھا، مگر پھر بھی وہ گردن زدنی!! سچ ہے۔ اُشتراکیت کی شریعت میں حق و باطل کا کوئی معیار نہیں[1]۔"

موجودہ روس کا استبدادی نظام اب کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ خود استالن کے وضع کردہ دستور (۱۹۳۶ء) میں اس کا نشان ملتا ہے دیکھو[2]: دفعہ ۱۳۱، ص ۷۹)۔

و۔ اجتماعی ضابطہ بندی (Regimentation)

جور و استبداد ہی کے سلسلے کی ایک چیز جو اس وقت سوویٹ روس کے ہر شعبۂ حیات پر حاوی ہے، وہ ہے اجتماعی ضابطہ بندی یعنی صرف پیداوار اور ذرائع پیداوار ہی نہیں، بلکہ عقل اور فکر بھی حکومت کی منصوبہ بندی (Planning) کے ماتحت کام کرنے پر مجبور ہیں۔ جو ریاست چاہتی ہے وہ سکھاتی ہے۔ جو معلومات پبلک بلکہ لکھے پڑھے طبقوں سے چھپانا چاہتی ہے، اُسے دبا دیتی ہے۔ سوویٹ یونین کی آمریت صرف معاشیات ہی پر نہیں، بلکہ انسانی عقل و فکر پر بھی ہے چھری کے

[1] مطلب یہ ہے کہ اُن کو اپنے اصول کے اعتبار سے ہماری نظر میں تو سب اہل باطل ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ٹراٹسکی اپنے کفر میں راسخ العقیدہ تھا اور سٹالن باطل پرستی میں بھی منافق ہے۔ اس لئے ٹراٹسکی کا کیرکٹر تو ہمیں ایک شریف انسان کی حیثیت سے اپیل کرتا ہے۔ مگر استالن اور اس کے حواری نفاق و فریب کاری کا مجسمہ معلوم ہوتے ہیں۔

[2] مطبوعہ ماسکو ۱۹۴۵ء۔

جوتوں اور لکڑی کی میزوں کی طرح انسان بھی گویا موادِ خام سے تیار کئے جاتے ہیں اور ان کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ اسکی موجودہ زبان میں Regimentation کہتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام روسی باشندے دنیا کے صحیح حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔

لوئی فلیشر اس بے خبری کا ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہے:۔

میرا بیٹا جارج امریکی فوج میں کپتان تھا۔ دوران جنگ میں وہ ایک میں سوویٹ یوکرین میں بھی متعین رہا۔ چونکہ اس کی اٹھان روس ہی میں ہوئی ہے، اس لئے وہ روسی زبان میں بے تکلفی سے گفتگو کر سکتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں امریکی فوجیوں اور افسروں نے صدارتی انتخاب میں اپنے ووٹ دیئے۔ رائے دینے سے پہلے طبعی طور پر ان میں بحث و مباحثہ ہوا اور حریف امیدواروں کی صلاحیتوں پر گفتگو ہوئی۔ سوویٹ فوجی، جو امریکی دستوں کے ساتھ تھے، یہ گفتگو اور بحث و مباحثہ سن کر بہت حیران ہوئے اور پوچھنے لگے:

"یہ کیا ماجرا ہے؟ جارج نے جواب دیا: ہر چار سال میں، ہم ایک پریزیڈنٹ منتخب کرتے ہیں۔ اب کے ڈیموکریٹ امیدوار روزولٹ ہے اور کئی برس وہ صدر رہ چکا ہے۔ اور ری پبلکن امیدوار ڈیوی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک ان دو میں سے کسی ایک کو ووٹ دے گا۔"

سرخ فوج کا لفٹنینٹ بول اٹھا "گویا تم یہ کہتے ہو کہ روزولٹ ایک ڈیموکریٹ ہے اور وہ کئی برسوں سے صدر ہے۔ اور اس کے باوجود فوج میں ری پبلکن موجود ہیں!"[1]

شالن تو کب کا اپنے حریفوں کو ختم کر چکا ہوتا۔ اس لئے ان غریب افسروں کا تعجب حیرت انگیز نہیں۔ یہ وہاں کی عام حالت ہے۔

---

[1] ص ۲۸۰-۲۷۹۔

اب ہم ایک دو مثالیں دے کر اس باب کو ختم کرتے ہیں۔ مثالیں اتنی ہیں کہ اگر ان کو کھنگالا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے۔ امریکی پروفیسر Fredrick C. Barghoom روسی باشندوں کے غیر ملکیوں سے ملنے اور اس کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"روسی انتہائی تجسّس نگاہ رکھتے ہیں۔ بسا اوقات نئی چیزوں، نئے خیالات اور خاص کر نئے مادّی وسائل اور سامانِ عیش و عشرت کو دیکھ کر اُن کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی۔ ان کی اپنی ضابطہ بندی کی (Regimented) زندگی اور مادی غربت نے اُن چیزوں کے متعلق انھیں انتہائی زود حس اور اثر پذیر بنا دیا ہے، جنھیں ان کا پریس مغربی تہذیب کی چمک دمک سے تعبیر کرتا ہے۔"[1]

ایک دوسری جگہ یہی مضمون نگار سوویٹ یونین میں اسٹیٹ کے اقتدار اور پبلک کی مقید و محدود زندگی کا اس طرح ذکر کرتا ہے:۔

"سوویٹ نظام اور پبلک کے تعلقات میں، سوویٹ نظام کا پلّہ بھاری اور اس کا اقتدار ہمہ گیر ہے۔ اپنے انعام اور سزا کے نظام کے ذریعہ یہ قوم کے دماغ اور عزائم پر اقتدار رکھتا ہے۔ پولیس اور ہر جگہ پھیلے ہوئے پارٹی ممبروں کی مدد سے مخالف جماعتوں کی تنظیم کو روک سکتا ہے۔ بلکہ بڑی حد تک یہ انسانی فکر پر بھی اقتدار رکھتا ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں، سلبی طور پر احتساب (سنسر شپ) کے ذریعہ اور ایجابی طور پر تعلیم اور مخصوص پروپگنڈا کی مدد سے۔"[2]

اس اجتماعی ضابطہ بندی کے سلسلے میں لوئی فیشر کا ایک اور بیان پڑھ لیجئے:۔

---

[1] سول اینڈ ملٹری گزٹ۔ مورخہ ۱۴ ردسمبر ۱۹۵۲ء۔ [2] سول، ۱۶ نومبر ۱۹۵۲ء۔

بسا اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ سویٹ گورنمنٹ غیر ملکیوں کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ایک حد تک یہ صحیح ہے۔ اصلی حقیقت یہ ہے کہ سویٹ حکومت خود اپنی رعایا بلکہ اپنے اونچے افسروں کو بھی شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ورنہ وہ غیر ملکی اخباروں کے داخلے پر کیوں پابندیاں عائد کرتی؟" (ص ۲۴۷)

پہلے ۱۹۳۰ء میں اور اس کے لگ بھگ غیر ملکی اخباروں کی اجازت تھی۔ لیکن اب یہ سلسلہ کئی سالوں سے بند ہو چکا ہے۔ ان چند لائبریریوں میں جہاں غیر ملکی اخبار آتے ہیں، صرف منتخب اشخاص جا سکتے ہیں۔ اور تو اور کوئی شخص ٹراٹسکی یا بخارن (Bukharin) کی کوئی کتاب نہ مستعار لے سکتا ہے نہ خرید سکتا ہے۔ اور ان ہی دونوں پر موقوف نہیں، ہر ایسے مصنف کی تصنیف پڑھنا ممنوع ہے جس نے سٹالن سے کبھی ٹکر لینے کی جرأت کی ہو۔" (ص ۲۴۷-۸)

۴۔ معاشی اصولوں میں ترمیمیں یہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ اشتراکیت یا اشتمالیت کی دیواریں مادہ اور روٹی کی بنیادوں پر اٹھائی گئی ہیں۔ اس لئے خیال کیا جاتا تھا کہ مارکس کے ماننے والے (اگر وہ اپنے 'کفر' اور 'ایمان بالخبز' میں سچے ہیں) کم سے کم اپنے معاشی اصولوں پر تو قائم رہیں گے۔ لیکن فطرت سے لڑائی مول لینا آسان نہیں۔ غیر فطری اصولوں پر نظام معیشت کب تک چل سکتا تھا؟ —— یہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ مارکس کے بتائے ہوئے اصول کبھی بھی اپنی اصلی شکل میں عملی جامہ نہیں پہن سکے۔ آغاز کار ہی میں لینن کو کسانوں کے ساتھ خاصی رعایتیں کرنا پڑیں۔

انقلاب کے بعد پہلا دور تو شکست وریخت کا تھا۔ اس کے بعد ہی حالات نے انھیں نئی اقتصادی پالیسی (N.E.P) چلانے پر مجبور کر دیا، جس میں شخصی ملکیت اور آزاد تجارت

کی خاصی رعایتیں دی گئی تھیں[1]۔ پھر جوں جوں حالات بدلتے گئے، ان رعایتوں کی نوعیتیں بھی بدلتی گئیں، تاآنکہ ۱۹۳۶ء کے دستور میں ذاتی ملکیت اور میراث تک کے حقوق تسلیم کر لئے گئے[2]۔ یہ تبدیلیاں اس وقت تک جاری ہیں۔ اس وقت پوزیشن یہ ہے کہ ذرائع پیداوار تو یکسر اسٹیٹ کے قبضہ میں ہیں، اور اس حد تک روس کے موجودہ نظام کو مملکتی اشتراکیت (State Socialism) کی ایک شکل سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کو چھوڑ کر اشتراکیت کے اصلی معاشی نظام (یعنی وہ نظام جس کی تبلیغ و تشریح مارکس اور اس کے شاگردوں نے کی) میں بے شمار تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اور یہ، جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں، انسانی دماغ کے وضع کردہ اصولوں کا خاصہ ہے، انسانی عقل محدود ہے، معلوم نہیں کتنی ہی دیدہ ریزی سے وہ کوئی اصول وضع کرے گی، کچھ دنوں کے بعد اس میں نقص ضرور ظاہر ہو گا۔ ہمہ گیری پائیداری اور نقائص سے پاک ہونا تو صرف قوانین الٰہی کی خصوصیت ہے ــــــ بہر حال ہم یہاں مختصر طور پر ان تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہیں جو سوویٹ روس کے نظام معیشت میں جگہ پا چکی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ معاشی مساوات اور اشتراکیت کے بلند بانگ دعووں کا کیا حشر ہوا؟

(۱) **شخصی ملکیت**:- اس سلسلے میں ہم بلا کسی تبصرے کے ۱۹۳۶ء والے روسی دستور سے ایک دو اقتباس پیش کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں۔ (ترجمہ مقدور بھر لفظی ہو گا):-

"پبلک اور اجتماعی زراعتی فارم سے بنیادی (Basic) آمدنی کے علاوہ اجتماعی فارم میں ہر کنبہ اپنے ذاتی استعمال کے لئے ایک مختصر قطعہ زمین کا مالک ہوتا ہے، جو اس کے سکونتی مکان سے متعلق ہوتا ہے۔ نیز ذاتی ملکیت کی حیثیت

---

[1] برٹانیکا کا مقالہ Commonism
[2] ملاحظہ ہو دفعہ ۱۰،۷،۹ -

سے قطعہ زمین کے لئے ایک امدادی عملہ اور ضروری انتظام ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک رہنے کا مکان، مویشی، مرغی خانہ اور معمولی زراعتی آلات بھی زراعتی رقبہ کے علاوہ فراہم کئے جاتے ہیں۔"

(دفعہ ۷؛ ص ۵۲)

اس سے بھی زیادہ نمایاں اور اہم تبدیلی کا اعتراف دفعہ ۹ میں دیکھئے:۔

"معیشت کے اشتراکی نظام کے ساتھ، جو متحدہ پنچائتی پرجا راج (U.S.S.R) میں غالب نظام معیشت ہے۔ انفرادی کاشتکاروں، اور دستکاروں کو معیشت کا مختصر ذاتی نظم کرنے کی بھی قانون اجازت دیتا ہے، بشرطیکہ وہ ان کی ذاتی محنت پر مبنی ہو اور دوسروں کی محنت استعمال نہ کی جائے۔" (ص ۵۲)

(۲) ترکہ:۔ اشتراکی نظام کی خصوصیت یہ بتائی جاتی تھی کہ اس میں ہر فرد کو زندگی کی ابتدا میں یکساں مواقع ملتے ہیں۔ ترکہ چونکہ زندگی کی بسم اللہ (Start) میں نمایاں فرق اور تفاوت پیدا کرسکتا ہے، اس لئے اشتراکی شریعت میں یہ قطعاً ممنوع تھا۔ نئے دستور نے اس کی بھی اجازت دے دی ہے:۔

"..... اور حقوق کی طرح شہریوں کی ذاتی ملکیت میں میراث کا حق بھی قانون کی رُو سے محفوظ کرلیا گیا ہے[۱]"، (دفعہ ۱۰؛ ص ۵۳)۔

(۳) سود:۔ سود سرمایہ داری نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اشتراکیت تو معمولی تجارت میں بھی وسائل پیداوار پر شہریوں کا حق تسلیم نہیں کرتی، مگر آپ کو حیرت ہوگی کہ معاشیات

---

[۱] Webbs لکھتے ہیں کہ ان ذاتی زمینوں کی پیداوار کو کسان قریب کے آزاد بازار میں فروخت بھی کرسکتے ہیں (دیباچہ؛ ص xxx)۔ لیجئے آزاد تجارت کی اجازت بھی مل گئی، گو ابھی محدود ہی سہی؛ [۲] دیکھو Webbs کی کتاب ج ۲ دیباچہ

کی سب سے بڑی لعنت یعنی زر سے زر پیدا کرنے کو سویٹ نظام معیشت روا رکھتا ہے۔ یہ ہے

اصول اور عمل کا تضاد۔ وب صاحبان لکھتے ہیں :-

"اسٹیٹ سیونگ بنک اپنی بیس ہزار شاخوں کے ساتھ ملک کے طول و عرض میں کام

کرتا ہے.......... جمع کرنے والوں کی تعداد اور ان کی جمع کردہ رقم ہر سال

ایک معقول شرح کے ساتھ بڑھتی رہتی ہے" [ا]

(۴) بیمہ :- سرمایہ داری نظام میں عام ہوس اور لوٹ کھسوٹ کی گرم بازاری کی وجہ سے ہر شخص کو اپنی فکر دامن گیر رہا کرتی ہے، اس لئے بیمہ کا رواج عام ہو گیا ہے، جس میں سود اور قمار بازی دو خرابیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام میں ان چیزوں کی مطلق گنجائش نہیں۔ وہاں تو بیت المال پوری قوم کا اجتماعی دار التامین (Insurance House) ہے۔ مگر اشتراکی نظام میں بیمہ کی اجازت بھی اب مل گئی ہے اور اس کا کاروبار خوب چلا ہوا ہے [ا]۔ گویا اسٹیٹ شہریوں کی کفالت کی ذمہ داری پورا کرنے سے قاصر ہے۔

(۵) زرعی ملکیت :- مارکس کے ٹھیٹھ نظریوں میں تو کسانوں کے لئے کوئی خاص گنجائش تھی ہی نہیں۔ لینن نے اپنی "تجدیدی فکر" سے ان کے لئے بھی اپنے انقلابی پروگرام میں جگہ پیدا کی۔ پھر نئی اقتصادی پالیسی (n.e.p) میں ان کے ساتھ اشتراکیت کے اصول کے خلاف کافی رعایتیں کی گئیں، یہاں تک کہ ۳۶ء کے دستور میں ایک خاص حد تک اُن کے لئے شخصی ملکیت کا حق بھی تسلیم کر لیا گیا۔ اب نئے حالات یہ ہیں کہ جنگ کے دوران میں کسانوں کا رجحان شخصی ملکیت کی طرف بڑھتا گیا اور حکومت ان کے ساتھ نرمی برتنے پر مجبور ہوئی، ورنہ پیداوار کی رفتار دھیمی ہو جاتی۔ پروفیسر فریڈرک سی بارگورن لکھتا ہے :-

---

ا۔ Soviet Communism ص ۹۲ (ملخص) ۔ ملاحظہ ہو: وب کی کتاب (ص ۹۲) نیز دستور (...)

".......اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ لڑائی کے دنوں میں، کسانوں نے حکام کی اجازت سے اپنی ذاتی زمینوں میں خاصی توسیع کر لی ہے، اور ان پر زیادہ توجہ کرنے لگے ہیں جس سے لازمی طور پر زراعتی فارم کے اجتماعی نظام کو نقصان پہنچا ہے۔ ۱۹۴۶ء کے موسم بہار سے سوویٹ لیڈروں نے کسانوں کو انضباط و نظم کا پابند کرنے کی زبردست مہم شروع کر دی ہے۔"[1]

اس سے پہلے یہی مضمون نگار یہ فقرے بھی قلم بند کر چکا ہے:۔

"بہر حال اتنا واضح ہے کہ کسان اجتماعی زراعت کے نظام میں ترمیم اور ڈھیل کو پسند کریں گے تاکہ وہ ان انفرادی زمینوں پر زیادہ توجہ صرف کر سکیں، جن کی اب انھیں اجازت ہے۔"[2]

(۶) اجرت کا فرق ۔ اشتراکیت کا نصب العین تو یہ ہے کہ سوسائٹی کے ہر فرد کو ضرورت کی چیزیں اس کی ضرورت کے مطابق فراہم کی جائیں، اور کارکردگی یا محنت کے تناسب کا خیال نہ کیا جائے۔ یہ تو اس کا نصب العین ہے۔ سردست یہ طے پایا تھا کہ ہر ایک کو اس کی کارکردگی کے اعتبار سے ضرورت کی چیزیں فراہم کی جائیں۔ شروع شروع تو یہ تفاوت کچھ ایسا زیادہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ "مومنین اشتراکیت" کو کھٹکتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ یہ تفاوت بڑھتا گیا، تا آنکہ اصول مساوات ہی کو انھوں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ کامل مساوات کا تصور خالص بورژوا تصور ہے۔[3] بہر حال کامل معاشی مساوات کا تصور..

---

[1] سول: مورخہ ۲۳ نومبر ۱۹۴۶ء۔ [2] ,, ,, ,, [3] یہ فقرہ کامریڈ مالوٹوف کا ہے۔ سٹالن صاحب اس سلسلے میں اور واضح طور پر فرماتے ہیں:۔

"یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ اشتراکیت مساوات کی داعی ہے، اس معنی میں کہ سوسائٹی کے تمام افراد کی ذاتی زندگیاں اور ضرورتیں برابر ہو جائیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کے خیال کا مارکسیت یا لینینیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔" (د و ب: ص ۳، ۵)

پرولتاری ہو یا بورژوا، ایک غیر فطری تصور ہے، اس لئے عملی میدان میں اس کی ناکامی لازمی تھی۔ ہمیں یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ سوویٹ روس میں معاشی مساوات کی پرچھائیں بھی نہیں نظر آتی۔ اور یہ جو نام نہاد اشتراکی غریبوں اور مزدوروں کو اس جنت الحمقا کے روح پرور افسانے سنایا کرتے ہیں، ان کی حیثیت پروپگنڈے سے زیادہ نہیں ہے۔ اب آئیے، ہم اپنے بیان کی توثیق کے لئے دو چار شہادتیں پیش کر دیں۔ پہلے ہم دستور ہی سے شروع کرتے ہیں۔

"پنچائتی پرجا راج کے شہری کام کا حق رکھتے ہیں یعنی انھیں روزگار ملنے اور کام کی مقدار (Quantits) اور نوعیت (Quality) کے لحاظ سے اجرت ملنے کی ضمانت دی جاتی ہے" (۱۱۸)۔

کہئے "ہر ایک کی ضرورت کے مطابق" (Each according to his needs) کا خواب کیوں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا؟ انسانی مساوات کے دعوے داروں کی ایک اور شکست ملاحظہ ہو:۔

"آرام اور فرصت کی ضمانت مزدوروں کی بھاری اکثریت Overwhelming Majority کو دی جاتی ہے، اس طرح پر کہ کارکردگی کے دن سات گھنٹوں کے کر دئے جائیں...... (دفعہ ۱۱۹)

لیکن وہ معمولی اقلیت، جسے یہ حق نہیں دیا گیا، کیا وہ انسانوں کے دائرے سے باہر ہے؟ آخر یہ کیسی مساوات ہے؟

مزدوروں کی اجرت کے درمیان تفاوت کا صحیح اندازہ وب صاحبان کے اس بیان سے ہوگا:۔

"مزدوروں کی اصل جماعت آٹھ یا اس سے بھی زیادہ درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ یہ درجے درکنہ ور فردی کے نہیں، بلکہ مہارت اور صلاحیت کے اعتبار سے ہیں ——

یہ درجے اصل میں شرح اجرت کے درجے ہیں۔ جو ہر کام کی سماجی قدر (Social Value) کے لحاظ سے معیّن کی جاتی ہے۔ یہ شرح اجرت ایک سے لے کر آٹھ گُنا تک بڑھتی ہے[1]۔

(۷) اصول مساوات کا فقدان   ابھی آپ کامریڈ سٹالن کا یہ قول پڑھ چکے ہیں کہ "معاشی مساوات کا نظریہ مارکسیت یا لینینیت سے دُور کا بھی تعلق نہیں رکھتا۔" اسی کے ساتھ آگے چل کر وہ فرماتے ہیں: "اشتراکیت اصل میں طبقات کی تقسیم کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کا مطمح نظر یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق سامانِ زندگی مل جائے۔ اور ہر شخص کی ضرورت برابر نہیں ہو سکتی، یہ بالکل ظاہر بات ہے[2]۔"

اوّلاً تو یہی سوال محلِ نظر ہے کہ مارکس نے کامل مساوات کی تبلیغ نہیں کی تھی اور مارکسیت انفرادی مساوات کی داعی نہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے سٹالن اور اس کے حواریوں کا کہنا مان بھی لیا جائے تو ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ موجودہ سویٹ نظام طبقات کے ختم کرنے میں بھی یکسر ناکام رہا ہے۔ لڑائی کے بعد طبقاتی امتیاز خاصہ نمایاں ہو گیا ہے، بلکہ بعض لحاظ سے سرمایہ دار جمہوری ملکوں کی نسبت طبقاتی تفاوت روس میں زیادہ ہے۔ آئیے، لوئی فیشر کی زبانی سنئے:۔

"امیر اور غریب کے درمیان معیارِ زندگی کا فرق سرمایہ دار ملکوں کی نسبت سویٹ روس میں زیادہ نمایاں ہے۔ سٹالن ایک معمولی تنخواہ لیتا ہے اور غالباً روپیہ کبھی نہیں چھوتا۔ لیکن ایک انسان جن مادی ضروریات کی خواہش کر سکتا ہے، وہ اس کے لئے فراہم ہو جاتی ہیں۔ سٹالن کم سے کم روز ولٹ کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک سویٹ مزدور امریکی مزدور کی نسبت بہت کم آرام و آسائش کے سامان پا سکتا ہے۔"

---

[1] سویٹ کمیونزم، ص ۱۴۴۔ [2] سویٹ کمیونزم ص ۳، ۵۔

سوویٹ زندگی میں یہ تفاوت کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ ۱۹۳۰ء کے دوران میں سوویٹ ریویو نے مساوات کا مذاق اُڑانا شروع کیا اور مساوات کے تصور کو بورژوا تعصب، اور جمہوری حماقت کا نام دینے لگے۔ اس کے بعد زندگی کے عدم مساوات اور تفاوت کی خوب تبلیغ کی گئی ــــ

اس کا مقصد ایک اونچا طبقہ، ایک ممتاز (Privileged) طبقہ پیدا کرنا تھا۔

سٹالن نے جان بوجھ کر روس میں امراء کا نیا طبقہ (Aristocracy) پیدا کیا ہے۔[1]

یہ عدم مساوات دیکھ کر لوئی فیشر کے اندر چھپی ہوئی اشتراکی روح یوں فریاد کرتی ہے:۔

سرمایہ داری نظام، غربت کے ساتھ ساتھ مسرفانہ رہائش کو رواج دیتا ہے، مگر روس میں اونچے طبقے اور عام لوگوں کے درمیان یہ دن بدن بڑھتی ہوئی تمیز اور معاشی تفاوت اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے، اس لئے کہ یہاں اونچے طبقے والے نچلے طبقوں کے رفیق (Comrade) اور خدمت گذار تصور کئے جاتے ہیں۔ مساوات پسندیدہ چیز ہو یا نہ ہو، لیکن اگر بالشوزم کا پیدا کردہ نظام امیر اور غریب کے درمیان اس روز افزوں نمایاں تفاوت کی حوصلہ افزائی کرتا ہو، تو انقلاب ایک بے معنی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔[2]

(۸) **مذہبی آزادی** مذہب، مارکس کے نزدیک افیون ہے۔ انقلاب کے بعد شروع شروع مذہب کے خلاف خوب خوب پروپگنڈا کیا گیا۔ طرح طرح سے مسخرہ پن کی نمائش کی گئی

---

[1] The Great Challenge (ص ۲۴۳-۲۴۲) [2] روس کے اندر عام غربت اور فقر کا یہ عالم ہے کہ اس وقت جرمنی میں جو روسی فوجیں مقیم ہیں، ان کے پاس صرف ایک ہی وردی ہوتی ہے۔ دھونے دُھلانے کے لئے بھی ایک فاضل جوڑا نہیں ہوتا (اسٹیٹسمین: ایڈیٹوریل مورخہ ۲ر فروری ۱۹۴۶ء)

مذہبی خیال رکھنے والوں کو معمولی شہریت کے حقوق سے محروم کیا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ اس رویّے میں بھی کچھ تبدیلی ہوئی ہے۔ جمہوری حکومتوں کی طرح اب سوویٹ نظام میں بھی انفرادی عبادت کی اجازت مل گئی ہے۔ یوں تو یہ حق ۱۹۳۶ء کے دستور میں تسلیم کر لیا گیا ہے، مگر پچھلی بڑی لڑائی کے زمانے میں اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا اور اس تبدیلی کو خوب شہرت دی گئی، تاکہ سرمایہ دار ملکوں کی رعایا روس کی طرف سے بدگمان نہ رہے۔ اس رویّے میں تبدیلی کی اور خاص وجہ یورپ کے بعض مشرقی ملکوں (جیسے پولینڈ) میں رومن کیتھولک فرقے کی کثرت بھی تھی۔ پولینڈ پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے روس کے کیتھولک کلیسا کو آزادی دینا ضروری تھی۔ بہرکیف مختلف اسباب کے ماتحت اب سوویٹ روس نے اپنے اصول و مسلک کے خلاف جمہوری سرمایہ دار ملکوں کی طرح شہریوں کو انفرادی عبادت کی اجازت دے دی ہے۔ دستور کے الفاظ یہ ہیں:۔

"شہریوں کی آزادیٔ ضمیر کے تحفظ کے لئے 'پنچائتی پرجاراج' میں کلیسا کو ریاست سے بالکل الگ کر دیا گیا ہے۔ اور اسکول کو کلیسا سے۔ مذہبی عبادت اور خلاف مذہب (Anti-religious) پروپگنڈے کی آزادی تمام شہریوں کے لئے تسلیم کی جاتی ہے" (دفعہ ۱۲۴)۔

یہ اجازت نامہ خود دلوں کا چور ظاہر کر رہا ہے۔

ایک صاحب قلم روس کی مذہبی آزادی اور دوران جنگ میں اس کے پروپگنڈے پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"سوویٹ فوجی افسروں کے جو تین نئے اعزازی نشان تجویز کئے گئے ہیں، ان میں ایک سینٹ الکزینڈر نوسکی (Alexander Novsky) کے نام پر ہے

ماسکو ریڈیو نازیوں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کے لئے کیتھولک، پراسٹنٹ اور یہود سب کو

یکساں اپیل کرتا ہے۔ ان واقعات کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے، اور نہ اس رپورٹ کو کہ سٹالن

نے روزولٹ کے لئے رحمت و مغفرت کی دعا کی۔ مذہبی طرز بیان روسی زبان میں گھل مل گیا۔

لینن نے بارہا کہا ہے: "خدا ہماری مدد کرے"[1]

دوسری طرف کلیسا کے باب میں روس کے رویے میں ارتقاء ضرور قابلِ توجہ ہے۔ ایک مشہور

مذہبی مقتدا ریورینڈ بنیامین کے قول کے مطابق پہلے یہ رویہ بالکل سلبی تھا، اس کے بعد شک و شبہ

کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ بعد میں یہ صلح آمیز ہو گیا۔ اور اب کلیسا کی افادیت کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔

اسی لڑائی کی پالیسی اور سیاست کاری کے سلسلے میں روس کے مظلوم مسلمانوں کی طرف بھی

نظرِ عنایت مبذول ہوئی۔ زکی علی مصری راوی ہیں:۔

"دوسری عالمگیر جنگ سے کچھ پہلے آنے والی کشمکش کے آثار دیکھ سوویٹ یونین کے مسلمانوں

کے خلاف تشدد آمیز پالیسی میں لچک پیدا کرنا مناسب خیال کیا گیا۔ بلکہ ماسکو گورنمنٹ

نے ایک حد تک ان کی دلجوئی کی بھی کوشش کی، ایک روسی عالم کو وولگا اور اورال کے

علاقوں کے مسلمانوں کا مفتی اعظم مقرر کیا"[2]

یہ سب جنگ کے سلسلے میں تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سوویٹ روس کے نزدیک اصول

کوئی چیز نہیں۔ مصلحت پرستی اور ابن الوقتی آخر اور کس چیز کا نام ہے؟ مذہب جب آپ کے

خیال میں انسانی عقل و دماغ کے لئے افیون کی حیثیت رکھتا ہے تو پھر اس افیون کی کاشت

اور خرید و فروخت کی اجازت دینے کے کیا معنی؟ یا تو آپ کا اور آپ کے پیشوا مارکس کا فلسفہ غلط،

---

[1] People's story of Soviet Russia by A. R Williams). صفحہ ۲۷۶

[2] Islam in the World دوسرا اڈیشن، ص ۳۵۱-۳۵۰

یا پھر آپ کا یہ طرزِ عمل خالص مصلحت پرستی پر مبنی ہے۔ ایک با اصول پارٹی کے لئے دونوں میں سے کوئی شکل باعثِ فخر نہیں ہو سکتی۔

اس بے اصولا پن کا ایک اور نمونہ قابلِ توجہ ہے۔ ۱۹۳۶ء کے دستور پر غور و خوض کے سلسلے میں ہزاروں ترمیمیں موصول ہوئی تھیں۔ اُن میں ایک ترمیم کا منشا۔ یہ تھا کہ:

"مذہبی مراسم کی بجا آوری ممنوع قرار دی جائے"

کامریڈ سٹالن نے اس ترمیم کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ ترمیم دستور کی رُوح کے خلاف ہے" حالانکہ کہنا چاہیئے تھا کہ "یہ ہمارے فلاں بنیادی اصول یا مارکس کے فلاں قول کے خلاف ہے" اس دستور کی رُوح تو آپ کی وضع کردہ، محرف اور اشتراکیت کی اصل تعلیمات سے کہیں دور جا پڑی ہے۔ خود مدعی، خود گواہ اسی کو کہتے ہیں۔ ہمارا تو کہنا ہی یہ ہے کہ یہ دستور اشتراکیت کے اصولوں سے انحراف کا مظہر اور اس لئے اس کی ناکامی کے اعتراف کے مرادف ہے۔

(۹) ایک نیا مذہب آپ اشتراکیت کی مذہب دشمنی کا حال تو بہت کچھ جان چکے۔ اب یہ حقیر آپ کو اشتراکیت کی ایک نئی صورت دکھانا چاہتا ہے۔ آپ کہیں گے یہ نئی صورت کیا ہوگی؟ ہم تو اس کے "قدر و قامت" کے "انداز" کو پہچانتے ہیں۔ مگر ذرا صبر کیجئے۔ واقعی یہ اشتراکیت کا نیا روپ ہے۔ اشتراکیت نے ایک مذہب کی شکل بھی اختیار کر لی ہے اور مارکس کی جگہ لینن اور سٹالن نے خدائی اور پیغمبری کا منصب اختیار کر لیا ہے۔ یہ مبالغہ نہیں۔ ہم اس بیان کو طول بھی نہیں دیں گے۔ سوویٹ روس کے بڑے مداح سڈنی ویب اور ان کی اہلیہ محترمہ کی مشترک کتاب (Soviet Communism) کے ایک دو بیان اس کی توضیح کے لئے کافی ہوں گے۔

لہ ص ۳۴۔

"حقیقت میں، کیا اپنی ذہنیت کے اعتبار سے، اور کیا اپنے شخصی طرزِ عمل کے آداب و قوانین میں، اشتمالی پارٹی مغربی یورپ کے ممتاز پیشوں (جیسے وکالت، ڈاکٹری، انجینیری، محاسبی وغیرہ) کی انجمنوں کی نسبت مذہبی تنظیم سے زیادہ مماثلت اور مشابہت رکھتی ہے"[1]

یہ تو صرف مشابہت کا معاملہ تھا۔ اس سے بڑی لعنت لیڈروں کی پرستش اور تقدیس (Idolisation) کی وبا ہے۔ مسز ووب لکھتی ہیں:۔

"ان امور میں سب سے زیادہ اہم ایک فرد کی معصوم لیڈر کی حیثیت سے عقیدت و پرستش، جس کی صرف تعظیم و اطاعت کی جا سکتی ہے۔ تنقید کسی حال میں نہیں۔ اس پرستش کا مظاہرہ لینن کے عام احترام و عقیدت کی صورت میں ہوا۔ خاص کر اس کی موت کے بعد، جب اسے ایک ولی اور پیغمبر کے درجے پہ پہنچا دیا گیا ——————

—————— لینن کی موت کے بعد اس بات پر سب متفق تھے کہ اس کی جگہ پُر نہیں کی جا سکتی۔ روسی مملکت کے ۱۶ کروڑ باشندوں کے لئے ایک دوسری شخصیت کی ضرورت تھی۔ خاص کر اس لئے بھی کہ اُن میں سے اکثر ناخواندہ اور اشتمالی پارٹی کے نئے فلسفے کی نزاکتوں کے سمجھنے سے عاجز تھے۔ اشتمالی پارٹی کے لیڈروں نے طے کیا کہ سٹالن کو پرولتاری طبقہ، پارٹی اور ریاست کے اعلیٰ سرپرست کی حیثیت سے روشناس کرانا چاہئے۔ اس کی تصویریں اور مجسمے لاکھوں کی تعداد میں تقسیم کئے گئے"۔

(ص ۱۷ء-۱۷۱ء)۔

مسز ووب صاحبہ کو توقع ہے کہ آہستہ آہستہ بُت پرستی کا یہ مرض کم ہوتا جائے گا، چونکہ مارکسیت

[1] دیباچہ طبع سوم ص ۱۷ء، جو مسز ووب کے نازک قلم کا رہینِ منت ہے۔

کی ضد اور اس کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے۔ لیکن ہمیں اُن کے برخلاف ایک دوسری بات کا یقین ہے۔ اور وہ یقین تاریخ عالم کے مطالعہ اور انسانی فطرت سے واقفیت پر مبنی ہے۔ زمانہ حال کے تجربے بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ پرستش اور بندگی انسان کی خمیر میں داخل ہے۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ اس زمین و آسمان کے مالک اور سارے جہان کے پروردگار کی بندگی کرو، یا پھر اپنے ہی جیسے گوشت پوست سے بنے ہوئے انسانوں کی اور یا اس سے بھی گر کر مٹی اور پتھر کے بتوں اور مورتیوں کی۔ عاجز اور مجبور انسان! تجھے تو بندگی بہر حال کرنا ہے اگر بہت ترقی کی، تو پھر اپنے نفس اور اپنی خام کار عقل ہی کی پرستش تجھے انتراہٹ میں مبتلا کر دے گی ـــــ ہم نے تو سوچ سمجھ کر اللہ رب العٰلمین کی بندگی کو اپنا شعار بنایا ہے۔ آئیے! اب ہم آپ کو بتائیں کہ اللہ رب العالمین کے وضع کردہ "نظام" میں انسان کی معاشی مشکلات کا حل کس طرح کیا گیا ہے؛ اور یہ ہماری اس کتاب کا آخری باب ہو گا۔

(۱۴)

اسلام کا معاشی نظام

۱۔ اعتدال کی راہ ہم نے کہیں اوپر بیان کیا ہے کہ جہاں تک سرمایہ داری پر تنقید اور اس کی بُرائیوں کے بیان کرنے کا تعلق ہے، مارکس ایک حد تک حق بجانب تھا۔ اُس کی اصلی غلطی یہ تھی کہ اس نے معاشیات کو حد سے زیادہ اہمیت دے دی۔ اسلام بھی سرمایہ داری نظام کا مخالف ہے۔ کمیونسٹ تو سرمایہ داری نظام سے سمجھوتہ کر سکتا ہے (جیسا کہ سویٹ روس کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے) مگر مسلمان ظلم و فساد سے کبھی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ سرمایہ داری نظام کی بے اعتدالیوں کا مٹانا بھی اس کا ایسا ہی فرض ہے، جس طرح اشتراکیت کی

فتنہ سامانیوں کا قلع قمع کرنا۔

سرمایہ داری اور اشتراکیت کی بے اعتدالیوں کے درمیان، اسلامی نظام معیشت ایک اعتدال اور بیچ کی راہ ہے۔ انتہاپسندی اور بے اعتدالی سے بچ کر دونوں نظاموں کی خوبیاں اس کے اندر سموئی ہوئی ہیں۔ جمہوریت نے شخصی بادشاہیوں کے خلاف علم بغاوت ضرور بلند کیا، مگر اس نے افراد کو اتنا شتر بے مہار بنا دیا کہ اجتماعیت اور اجتماعی اقتدار کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔ 'اشتمالیت' اور آمریت (ڈکٹیٹر شپ) دونوں جمہوریت کا ردِ فعل ہیں، گو مختلف سمتوں اور شکلوں میں۔ 'آمریت' نے اقتدار کی قدر تو تسلیم کی اور اسے خوب استعمال کیا، لیکن انفرادی جدوجہد کی روح تباہ کردی۔ دوسری طرف اشتمالیت نے نوچ کھسوٹ کی انفرادی آزادی کو دیکھ کر شخصی ملکیت کے خلاف بغاوت کی۔ اسلام ان سب کی اچھی اور صالح قدروں کو لے لیتا ہے اور انسانی فطرت کے متضاد رجحانات کے درمیان ایک حیرت انگیز امتزاج اور یک رنگی پیدا کرتا ہے۔ یہ اسلام کی اسی جامعیت اور ہمہ گیری کا نتیجہ ہے کہ انسانی دماغ کے پیدا کردہ مختلف نظریے اسلامی نظام میں اپنی تعلیمات سے کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور پاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب یورپ میں جمہوریت کا طوطی بول رہا تھا، تو دانش فروشوں نے اسلام کو بھی جمہوری نظام کہنا شروع کردیا۔ اسی طرح جب 'آمریت' نے پر پرواز نکالے، تو یاروں نے اسلام کو بھی 'آمریت' کا علم بردار قرار دے لیا۔ اور آج اشتراکیت کا بول بالا ہو رہا ہے، تو برادران یوسف، اسلام کو بھی 'اشتراکیت' کا مذہبی اڈیشن بتانے لگے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ اس التباس اور مغالطے کی وجہ دوسری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک مجموعہ اضداد در (Synthesis of opposites) نظام ہے، یعنی انسانی فطرت کی بے اعتدالیوں اور انسانی دماغ کی انتہا پسندیوں کے درمیان، ایک اعتدال اور بیچ کی راہ ہے

اس لئے قدرتی طور پر انسانی دماغ کے وضع کردہ نظاموں کے بعض اچھے اور روشن پہلو اس کے اندر ہم آہنگی اور تناسب مزاج کے ساتھ جمع ہو گئے ہیں۔ اور یہی چیز نہ جاننے والوں کے لئے غلط فہمی کا سبب بن جاتی ہے۔

اسلامی نظام کے سمجھنے میں غلطی کا ایک بڑا سبب اور بھی ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان کا معاشی مسئلہ زندگی کے دوسرے مسئلوں سے کوئی الگ چیز نہیں۔ انسانی زندگی اگر جسم ہے تو انسان کے عقائد، عقلی و دماغی مطالبات، سیاسی و معاشی تقاضے، قلب و جگر اور مختلف اعضا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی کے کسی ایک شعبے کا حل مجموعے سے الگ ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر غلطی سے اب تک ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ لوگوں نے معاشیات پر اتنی توجہ دی کہ انسانی زندگی کے دوسرے پہلو اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہ گئے، یا پھر 'معاشیات' ہی کو کُل زندگی سمجھ لیا گیا؛ اور اشتراکیت نے تو یہاں تک غلو کیا کہ 'معاشیات' کو محور مان کر زندگی کے تمام پہلوؤں (عقائد، مذہب، اخلاق) کو اس کے گرد گھمانا شروع کر دیا۔ 'اشتراکیت' کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ وہ معاش کے مسئلے کو مرکزی اور بنیادی مسئلہ قرار دے کر پوری انسانی زندگی کو اس کے تابع بناتی اور تمام دوسرے مسئلوں کو ایک گہرے معاشی تعصب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ انسانی عقل کی یہی بے اعتدالی ہے، جس نے معاشی مسئلے کو اتنا الجھا دیا ہے۔ ورنہ اگر انسانی زندگی میں 'معاشی مسئلہ' کو وہی جگہ دی جاتی، جو 'جگر' یا گردہ، (مثال کے طور پر عرض کیا جا رہا ہے) کو انسانی جسم میں حاصل ہے اور جس طرح ایک حاذق طبیب صرف 'جگر' یا 'گردہ' کے علاج پر اکتفا نہیں کر سکتا، بلکہ اسے مریض کے پورے جسم اور اس کے مزاج کی مخصوص کیفیتوں کا لحاظ کرنا ہوتا ہے؛ اسی طرح اگر انسانی زندگی کے تمام مسئلوں کے ساتھ اور ان کے مزاج کا لحاظ رکھتے ہوئے معاشی مسئلے کا حل تلاش کیا جائے، تو پھر کوئی پیچیدگی نہیں پیدا ہو سکتی۔

انسان کے معاشی مسئلے کے حل میں اسلام کا طریقہ ٹھیک ٹھیک یہی ہے۔ اسلام کا معاشی نظام ایک مکمل نظامِ حیات کا ایک جزء ہے۔ اسلامی نظامِ حیات کی ابتداء ایک اللہ کے تصور سے ہوتی ہے۔ اس کے سامنے کسی خاص مُلک، قوم، یا نسل کی بھلائی کا سوال نہیں، بلکہ اس کا مطمحِ نظر پوری انسانیت کی فلاح و بہبود ہے۔ انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام افراد کو صرف عام شہری اور سیاسی حقوق ہی نہیں، بلکہ معاشی حقوق میں بھی مساوات حاصل ہو۔ اور اس لئے اسلامی حکومت اپنے ہر شہری کے لئے زندگی کی لازمی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمّہ دار ہے۔

۲۔ کسبِ معاش کی آزادی اور اس کے حدود؛ یہ ذہن نشین رہنا چاہئے کہ اسلام میں 'مال' مقصود بالذّات نہیں۔ یہ صرف ذریعہ ہے، اپنی ذات، خاندان، عزیز و قرابت دار اور عام انسانوں کی خدمت کا مقصد نہیں۔ جو لوگ اُسے مقصد بناتے ہیں، خواہ وہ ملعون سرمایہ دار ہوں یا بلند بانگ اشتراکی، نفسِ انسانی کی تحقیر کرتے ہیں۔ اسلام نہ محتاجی اور گداگری کو پسند کرتا ہے اور نہ اس کے حدود میں سرمایہ داری کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ وہ نہ مسیحی راہبوں اور ہندوستانی جوگیوں کی طرح ترکِ دنیا کی ترغیب دیتا ہے اور نہ مادہ پرستوں کی طرح 'مال' اور 'روٹی' کی پرستش کراتا ہے۔ اسلام نہ سرمایہ داری نظام اور جمہوریت کی طرح ضرورت سے زیادہ انفرادیت (Individualism) پر زور دیتا ہے، اور نہ اشتراکیت اور کلیت پسند مملکتوں (Totalitarian States) کی طرح انفرادی جدوجہد کا خاتمہ یا اس پر ناروا پابندیاں عائد کرنا چاہتا ہے۔ یہ اُن تمام اصولوں اور ضابطوں کو تسلیم کرتا ہے، جو انسان کی قوتِ تسخیر اور تمدن کے ارتقا کا فطری مظہر ہیں، نہ امیر و غریب کی فطری تقسیم، محنت کی تقسیم کا اصول، اپنی محنت سے فائدہ اٹھانے کی طبعی خواہش، ہر شخص کو کسبِ معاش کی آزادی، اور ایک انسان کی یہ قدرتی خواہش کہ اُس کی چھوڑی ہوئی دولت سے اس کے بال بچے فائدہ اٹھائیں، ان فطری اصولوں

کو اسلام تسلیم کرتا ہے۔ اشتراکیت کی طرح یہ شخصی ملکیت کو ایک لعنت اور تمام خرابیوں کی جڑ نہیں سمجھتا۔ اپنی محنت کے پھل سے لطف اندوز ہونا ایک انسان کا فطری حق ہے۔ وہ زمین جہاں وہ کام کرتا ہے، وہ اوزار جن کی مدد سے وہ اپنے اہل وعیال کے لئے رزق کا سامان حاصل کرتا ہے، وہ گھر جہاں بیٹھ کر وہ اپنا پسینہ پانی کی طرح بہانے کا عادی ہے، ان سب چیزوں پر تصرف اور ان کی ملکیت کا جذبہ اسلام کی نگاہ میں ایک فطری جذبہ ہے، اور اسلامی قانون اسے جائز تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح تمدن کے ارتقا کو بھی اسلام بُرا نہیں سمجھتا۔ سائنس کی نئی ایجادات اور نئی مشینوں کے ذریعہ پیداوار میں ترقی اور ستھرا پن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اہمسا پرستوں اور تارک الدنیا جوگیوں کی طرح اسلام نئی صنعتوں اور نئی تجارتی ترقیوں کو بھی لعنت نہیں شمار کرتا۔ یہ سب انسان کی قوت تسخیر اور طباعی کے نتائج ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ افراد کو معاشی لوٹ اور غریبوں کا خون چوسنے کی اجازت دیتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ وہ افراد کو شتر بے مہار چھوڑ دیتا ہے۔ انفرادیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے ایسا نظریہ بھی ایجاد کر لیا جس سے شخصی حرص وہوس کی تگ ودو کو اجتماعی مفاد سے وابستہ کیا جا سکے۔ اور تو اور اس نے مملکت (اسٹیٹ) کو بھی نفع اندوزوں اور ظالم ساہوکاروں کی چیرہ دستیوں کی روک تھام سے روک رکھا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام امیر و غریب کے فطری فرق کو قانون کے زور سے نہیں ختم کرنا چاہتا۔ مگر جب یہ فرق کسی سیاسی یا اخلاقی ضابطہ کے بغیر بڑھتا ہی چلا جائے، جب فرد کے سامنے خود غرضی کے سوا کوئی محرک اور نفع اندوزی کے سوا کوئی اصول نہ ہو، اور جب مملکت غریبوں اور مزدوروں کی حفاظت اور ان کی چارہ گری کو اپنے فرائض کے دائرے سے خارج سمجھتی ہو، اس وقت یہ امیر و غریب کا فرق قطعی طور پر ایک لعنت بن جائے گا، اور ہر صالح

نظام اس کو ختم کرنا اپنا اولین فرض قرار دے گا۔ سرمایہ داری نظام کی یہ لعنت اسلامی نظامِ معیشت میں نہیں پیدا ہو سکتی۔ اسلام فرد کی آزادی کو تو تسلیم کرتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ وہ ایسے قانونی اور اخلاقی ضابطے عائد کرتا ہے، جن کے ہوتے ہوئے لوٹ کھسوٹ یا ناجائز انتفاع (Exploitation) ناممکن ہو جاتا ہے۔ اور جہاں معمولی قانون سے کام نہ چل سکے، وہاں اسلامی مملکت کو پورا اختیار ہے کہ ضروری تعزیری کارروائیاں عمل میں لائے تاکہ فتنوں کا سدِ باب ہو۔ مگر ان استثنائی (Exceptional) تعزیری احکام کی ضرورت شاذونادر ہی پڑتی ہے۔ اسلام کے قانونی اور اخلاقی ضابطے اتنے جامع مکمل ہیں کہ اسلامی نظام کے قیام اور ان پر صحیح عمل درآمد کی صورت میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لئے یہ بالکل کافی ہیں۔

اس سے پہلے کہ ان اخلاقی اور قانونی ضابطوں کی تشریح کی جائے، شخصی ملکیت اور کسبِ معاش کی آزادی سے متعلق ایک نکتہ کی توضیح کر دینا مناسب ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام شخصی ملکیت کی اجازت اور کسبِ معاش کی آزادی ضرور دیتا ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ افراد کو مصارف کے باب میں مطلق العنان چھوڑ دیتا ہے۔ حقوقِ ملکیت جو کسی شخص کو حاصل ہیں، وہ اتنے غیر محدود نہیں ہیں کہ اگر کوئی ان حقوق کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو، بلکہ اس کے ناروا استعمال سے اجتماعی فساد کا اندیشہ ہو، تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ کئے جا سکیں۔ اسلامی مملکت ایسے تمام افراد پر پابندیاں عائد کر سکتی ہے، جو اپنے مال میں مالکانہ تصرف کے اہل نہ ہوں، اور جو اپنی دولت کو بُرے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں۔ اُن کی جائداد کو اسلامی حکومت اپنے انتظام میں لے کر ان کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کرے گی۔ سورۂ نساء کی یہ آیت اس طرف رہنمائی کرتی ہے:-

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ　　　اور اپنا مال جسے اللہ نے تمہارے لئے

لكم قياماً وارزقوهم واكسوهم فيها وقولوا لهم قولاً معروفاً۔ (النساء ۔ ۵)

تمہارے زندگی کا ذریعہ بنایا ہے، نادانوں کے حوالہ نہ کرو، البتہ انھیں کھانے اور پہننے کے لئے دو، اور انھیں نیک ہدایت کرو۔

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ومن ههنا يؤخذ الحجر على السفهاء، وهم اقسام، فتارة يكون الحجر للصغير، وتارة يكون الحجر للجنون، وتارة لسوء التصرف لنقص العقل او الدين، وتارة للفلس، وهو ما اذا احاطت الديون برجل وضاق ماله عن وفائها، فاذا سأل الغرماء الحاكم الحجر عليه حجر عليه[1]

اسی آیت سے نادانوں پر پابندی عائد کرنے کا مسئلہ اخذ کیا جاتا ہے۔ کبھی یہ پابندی کم سنی کی وجہ سے عائد کی جاتی ہے، اور کبھی یہ پابندی جنون کے سبب سے ہوتی ہے، اور کبھی عقل کی کمی یا دینداری کی کمی کے باعث ناروا استعمال کی وجہ سے ہوتی ہے، اور کبھی دیوالیہ پن کی وجہ سے، جیسے ایک شخص پر قرضوں کا بار بہت بڑھ جائے اور اس کی دولت ان کی ادائی کے لئے ناکافی ثابت ہو تو جب قرض خواہ قاضی سے اس پر پابندی عائد کرنے کی درخواست کریں گے، وہ اس پر پابندی عائد کر دے گا۔

امام ابن جریر طبری نے مفسرین کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی رائے یہ لکھی ہے:۔

"یہ حکم ہر 'سفیہ' کے حق میں عام ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ مرد ہو یا عورت۔"

والسفيه هو الذي يضيع المال ويفسده بسوء تدبيره[2]

سفیہ وہ ہے جو مال کو اپنے سوء تدبیر سے تباہ و برباد کرتا ہے۔

امام بخاریؒ نے اس موقع[3] پر خاص باب قائم کیا ہے اور باب کے مضمون میں آیہ کریمہ:

[1] ج ۱، ص ۴۵۲۔ [2] بحوالہ فتح الباری (۹ : ۴۶۶)، مطبع انصاری، دہلی۔ [3] ۹ : ۴۶۶۔

أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ	کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم
مَا يَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ	ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں، ۔
اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۔ (هود: ۸۷)	جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟

یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشاء کے مطابق تصرف کا اختیار نہ ہو؟

سے استدلال کیا ہے۔ گویا شعیب علیہ السلام کی قوم اپنے مال میں مطلق العنان تصرف کا حق چاہتی تھی۔ اور حضرت شعیب علیہ السلام ناروا اور ناجائز تصرف پر پابندیاں عائد کرتے تھے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مال و دولت میں من مانی کارروائیوں اور مطلق العنان تصرف کا خبط کچھ اسی دور روشن خیالی کی پیداوار نہیں؟ پرانی جاہلیتوں میں بھی آزاد حق ملکیت کا تصور موجود تھا۔

امام بخاری اس باب میں حدیثیں بھی لائے ہیں، جن سے مال میں سوء تصرف اور "اضاعت" کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔ حدیث میں "اضاعۃ المال" کی حرمت کی تصریح ہے[1]۔

آئیے، اب ان اہم اخلاقی اور قانونی ضابطوں کا جائزہ لیں، جن کی بنیادوں پر اسلام کا معاشی نظام استوار ہوتا ہے۔

۳۔ اخلاقی ضابطے

(الف) حلال و حرام

سب سے بڑی پابندی جو اسلام فرد کی شتر بے مہار آزادی پر عائد کرتا ہے، وہ اس کے ذرائع آمدنی کو محدود کرنا ہے۔ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایک امتیازی خط کھینچتا ہے؛ اور کسب حلال پر بار بار زور دیتا ہے۔ اور حلال کو حرام کرنا، اور حرام کو حلال قرار دے لینا اسلامی شریعت میں بدترین معصیت ہے۔

---

[1] اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّهَاتِ ...... وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ وَاِضَاعَةَ الْمَالِ (۹: ۲۶۶)

قرآن مجید میں یہود کو بار بار اس پر تنبیہ کی گئی ہے۔ حلال کے دائرے میں محدود ہو جانے اور شریعت کی عائد کی ہوئی پابندیوں کے قبول کر لینے کے بعد ایک مسلمان پر خود بہ خود کسب معاش کی بہت سی جانی پہچانی راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ اس کے لئے صرف شراب پینا ہی حرام نہیں، بلکہ اس کی کشید یا خرید و فروخت سب حرام ہے۔ اسی طرح رشوت، قمار بازی، سٹہ بازی اور اس قسم کے دوسرے معاملات (جن کی تشریح قانونی ضابطوں کے تحت آگے آتی ہے) بالکل ممنوع ہیں۔

(ب) صرف پر پابندیاں اس اخلاقی ضابطے کی دوسری اہم دفعہ یہ ہے کہ فرد اپنی آمدنی کے صرف کرنے میں بالکل آزاد نہیں۔ وہ اپنی کمائی ہوئی دولت کا مالک تو ضرور ہے، مگر اس میں بے لگام تصرف کا حق نہیں رکھتا۔ اسراف و تبذیر کی تمام شکلیں اسلام میں ممنوع ہیں اور اس قسم کے لوگوں کو "شیطان کا بھائی" کہا گیا ہے۔ مسلمان ریشمی کپڑے اور سونا چاندی[1] کے سامان نہیں استعمال کر سکتا۔ موسیقی، لہو و لعب، قمار بازی، عیاشی اور اس طرح کے فواحش پر مسلمان کی دولت کا ایک حبہ بھی صرف نہیں ہو سکتا۔

(ج) انفاق پر زور آمد اور صرف پر پابندیاں عائد کرنے کے بعد اسلام، اللہ کی راہ میں

---

[1] مردوں کے لئے چاندی کے چند ماشوں کے علاوہ خالص چاندی کا استعمال قطعاً حرام ہے۔ عورتوں کے لئے حد مناسب سے زیادتی کو کراہت کے درجے میں ضرور رکھا گیا ہے۔ سونے اور چاندی کے برتنوں اور دوسرے سامان کا استعمال قطعی حرام ہے۔ چاندی اور سونے کے سامان میں صنعت کاری کی قیمت کا اعتبار اسلام میں اسی لئے نہیں کیا گیا ہے۔ گو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، مگر اتنی بات متفق علیہ ہے کہ اس صنعت کاری کی ہمت افزائی اسلام نے نہیں کی ہے۔ اس سے اصل مقصود سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال کم کرنا ہے۔ ان کا استعمال صنعت کاری ہی کی بدولت ہوتا ہے۔ اور جب سونے چاندی کے یہ مسرفانہ سامان استعمال میں نہیں آئیں گے، تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ نقدی کی کتنی فراوانی ہوگی؟

مال خرچ کرنے پر بہت زور دیتا ہے۔ قرآن کریم انفاق کی تاکید سے بھرا ہوا ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس کا بہترین عملی نمونہ پیش کیا ہے۔ غریبوں محتاجوں ہم سایہ، یتیموں، مسافروں کی خبر گیری کی بے شمار آیتوں اور حدیثوں میں تاکید کی گئی ہے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لئے قرآن میں طرح طرح کی دل آویز تمثیلیں دی گئی ہیں بخیلوں اور کار خیر سے ہاتھ روکنے والوں کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔ قرآن مجید کی آخری سورت سورۂ توبہ میں مومن کی علامت زکوٰۃ دینا اور ہاتھ کا روک رکھنا منافق کی علامت بتائی گئی ہے:-

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ (التوبہ-۶۷)	منافق مرد اور منافق عورتیں ایک دوسری کے ہم رنگ ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے منع کرتے ہیں، اور (اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے) اپنے ہاتھ روک رکھتے ہیں۔
وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (التوبہ-۷۱)	مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسری کے رفیق اور دمساز ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے "یہ منافقین کا مشترک خاصہ ہے کہ نیکی کے کام میں خرچ کرنے کے لئے اُن کا ہاتھ کبھی نہیں کھلتا"۔ اسی طرح بخل کو قیامت کے دن گردن کا طوق بتایا گیا ہے:-

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ	جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے
بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ	نواز اہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے
خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ	ہیں، وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی
مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ	اُن کے لئے اچھی ہے۔ نہیں، یہ اُن کے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا	حق میں نہایت بُری ہے، جو کچھ وہ اپنی
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (آل عمران - ۱۸۰)	کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں، وہی قیامت

کے روز اُن کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمان کی میراث اللہ کے لئے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُن سے باخبر ہے۔

سورۂ بقرہ کے تین رکوعوں (۳۶، ۳۷، ۳۸) میں مسلسل انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا گیا ہے، اور اللہ کی راہ میں خلوص نیت سے خرچ کرنے والوں کے لئے طرح طرح کے انعامات کی بشارت دی گئی ہے۔ یہاں اس تفصیل کی خاص ضرورت نہیں۔

(د) لین دین میں خوش معاملگی معاشی نظام میں لین دین کی خوش معاملگی کو جو اہمیت حاصل ہے اس پر کچھ کہنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ تمام تجارتی نظام خوش معاملگی پر قائم ہے۔ اسلام نے اس پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ قرآن مجید نے اس باب میں مفصل ہدایات دی ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ لین دین کے جھگڑے زیادہ تر اس لئے رونما ہوتے ہیں کہ معاملات تحریر میں نہیں لائے گئے۔ قرآن مجید کے احکام اس سلسلے میں بالکل واضح ہیں :-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ	اے ایمان والو: جب کسی مقرر مدت
بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ،	کے لئے تم آپس میں قرض کا لین دین
وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ،	کرو تو اُسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے

وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا
عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَ يُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ
وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ، فَاِنْ كَانَ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا
اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ
بِالْعَدْلِ ، وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ
مِنْ رِّجَالِكُمْ ، فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا
رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ
تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ
اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى
وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ،
وَلَا تَسْئَمُوْا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ
كَبِيْرًا اِلٰى اَجَلِهٖ ، ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ
عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰى
اَلَّا تَرْتَابُوْا اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ
تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ
فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا
وَاَشْهِدُوْا اِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَآرَّ

درمیان ایک لکھنے والا انصاف کے
ساتھ ایک دستاویز تحریر کرے،
جسے اللہ تعالیٰ نے لکھنے پڑھنے کی
قابلیت بخشی ہو، اُسے لکھنے سے انکار
نہ کرنا چاہئے۔ وہ لکھے اور جس پر
حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا) وہ
املا کرائے (یعنی دستاویز کا مطلب
بولتا جائے) اور اُسے اللہ اپنے رب سے
ڈرنا چاہئے اور جو معاملہ طے ہوا ہو اس میں
کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر
قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو
یا املا نہ کرسکتا ہو تو اس کا ولی انصاف
کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے مردوں
میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی لو۔
اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور
دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے
تو دوسری اُسے یاد دلائے۔ یہ گواہ ایسے
لوگوں میں سے ہونا چاہئیں، جو با اعتماد
ہوں، اور جن کی گواہی تمہارے درمیان

کَاتِبٌ وَّلَا شَہِیۡدٌ ، وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّہٗ فُسُوۡقٌۢ بِکُمۡ ، وَاتَّقُوا اللّٰہَ ، وَیُعَلِّمُکُمُ اللّٰہُ ، وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ، (البقرۃ - ۲۸۲)	مقبول ہو ۔ گواہوں کو جب گواہ بننے کے لئے کہا جائے تو انھیں انکار نہ کرنا چاہیے ۔ معاملہ، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، میعاد کے تعین کے ساتھ اس کی دستاویز لکھوانے میں کاہلی نہ کرو۔ اللہ کے

نزدیک یہ طریقہ زیادہ مبنی بر انصاف ہے اور اس سے شہادت قائم ہونے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے اور تمھارے شکوک وشبہات میں مبتلا ہونے کا امکان کم ہوتا ہے ۔ ہاں ! جو تجارتی لین دین دست بدست تم لوگ آپس میں کرتے ہو، اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی ہرج نہیں ۔ مگر اس طرح کی خرید وفروخت کرتی وقت گواہ کر لیا کرو، اور کاتب اور گواہ کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے ۔ ایسا کروگے، تو نافرمانی کا ارتکاب کروگے ۔ اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو (معاملے کی صفائی) سکھاتا ہے ۔ اور اُسے ہر چیز کا علم ہے ۔ (البقرۃ - ۲۸۲)

قرآن مجید میں خوش معاملگی کی یہ تاکید ! اور اللہ کی شان کہ قرآن کے ماننے والے آج دنیا میں بدمعاملگی کی وجہ سے بدنام ہیں ۔ جب تک ہم اسلام کی تعلیمات کا عملی مظہر نہ بنیں گے، ہماری ان باتوں پر کوئی یقین کیوں کرنے لگا ؟

(۵) قرض قرض انسان کی ایک ضروری حاجت ہے ۔ سودی قرض کو قانون کی رو سے قطعی حرام قرار دے کر اسلام نے اس ضرورت کا دفعیہ بھی قانون کے بجائے اخلاق سے کیا ہے ۔ اس نے ضرورت مندوں کو قرض دینا ثواب کا بہترین کام بتایا ہے ۔ لیکن جو لوگ قرض لے کر استطاعت کے باوجود ادا کرنے میں دیر کریں، اُن کو ظالم کا خطاب

دیا ہے۔ اور جو لوگ بے قرض ادا کئے مر جائیں، ان کے ترکے میں سب سے پہلے قرض ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ نیز قرض کی ادائی سے پہلے مدیون کے جنازہ کی نماز پڑھنے میں بھی تامل کیا گیا ہے۔

اسلام نے ضروری قرض کے لئے خود حکومت کو بلاسود قرض دینے کے انتظام کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ خلافت راشدہ میں بیت المال سے قرض لیا جاتا تھا، جس کی ادائی اگر مدیون کی زندگی میں نہ ہوئی، تو اس کی متروکہ جائداد اور دولت سے اس کی وصولی وصیت کے مطابق عمل میں آتی۔ اور اگر متوفّٰی کی وصیت نہ بھی ہوتی، تو بھی متروکہ سامان سے ترکہ کی تقسیم سے پہلے قرض ادا کر دیا جاتا۔[1]

ایسے قرضوں میں (یعنی جو قرضے ذاتی ضرورتوں کے لئے دیئے جائیں) اس امر بر بار بار زور دیا گیا ہے کہ مقروض کی مالی حالت اگر کمزور ہو، تو قرضوں کو معاف کر دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:-

وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ، وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْہِ اِلَی اللّٰہِ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ،

(البقرۃ: ۲۸۰-۲۸۱)

اور اگر قرض دار تنگ دست ہو، تو ہاتھ کھلنے تک اُسے مُہلت دو، اور صدقہ کر دو، تو یہ تمھارے لئے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔ اُس دن کی رُسوائی اور مصیبت سے بچو، جب تم اللہ کی طرف واپس ہوگے۔ (وہاں) ہر شخص کو اس کی کمائی ہوئی نیکی کا پورا پورا بدلا مل جائے گا۔ اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

روایتوں میں آیا ہے کہ یہ قرآن مجید کی آخری آیت ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] احکام القرآن (جصاص) ج ۲۔ ص ۱۱۵۔

کی وفات سے صرف چند روز پہلے نازل ہوئی۔ حدیثوں میں اس پر بار بار زور دیا گیا ہے[1]۔ اس کے علاوہ زکوٰۃ کی آٹھ مدوں میں سے ایک مستقل مد ادائی قرض کی ہے۔ جو لوگ مجبوری اور تنگ دستی کی وجہ سے اپنی قرض نہ ادا کر سکتے ہوں، اسلامی بیت المال اُن کی طرف سے ادا کرے گا[3]۔

۴۔ **قانونی ضابطے** نظامِ معیشت کی استواری اور اسے توسط و اعتدال کی شاہراہ (سواء السبیل) پر قائم رکھنے کے لئے اسلام نے جن قانونی ضابطوں سے کام لیا ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، سلبی اور ایجابی۔ یعنی پہلے اس نے زندگی کے اقتصادی نظام کو اُن آلودگیوں سے پاک کرنے کا حکم دیا ہے، جو عام طور پر پورے نظام کو آلودہ اور تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ اس کے بعد چند ایسی تدبیریں بتائی ہیں، نہ صرف بتائی ہیں، بلکہ اُن پر عمل فرض قرار دیا ہے۔ جن کی پابندی سے نظامِ معیشت میں وہ خرابیاں نہیں پیدا ہونے پاتیں، جو عام طور پر انسانوں کے وضع کردہ یک رُخے نظاموں میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہم پہلے سلبی ضابطوں کو لیتے ہیں:۔

(الف) سلبی قانونی ضابطے
(۱) سود سرمایہ داری نظام کی پیدائش میں سودی کاروبار کا بڑا دخل ہے۔ رُپیہ کے ذریعہ رُپیہ کمانا انسانیت کی سب سے بڑی لعنت ہے۔ اہلِ زر اسی کاروبار کے باعث کاہل ہو جاتے ہیں اور محنت کی قدر نہیں کرتے، اور جب وہ محنت اور مزدوری کی قدر نہیں جانتے، تو اُن کا دل پتھر ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگ ظاہر میں انسان اور باطن میں خونخوار درندوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر ان برائیوں کا انسداد اور اس فتنہ (سرمایہ داری) کی پوری بیخ کنی کر دی ہے۔

---

[1] ابن کثیر ۱، ۳۳۳۔ [2] ملاحظہ ہو، تفسیر ابن کثیر ج ۱۔ ص ۳۳۳۔ ۳۲۱۔

[3] احکام القرآن (جصاص) جلد ۳۔ ص ۱۵۶۔

اس نے سود کی ہر شکل کو قطعی حرام قرار دے کر سرمایہ داری نظام کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی ہے۔ اس نے ذاتی ضرورتوں کے لئے 'قرض حسن' اور تجارتی ضرورتوں کے لئے 'مضاربت' کی ترغیب دی ہے۔

ذاتی ضرورتوں کے لئے قرض کا ذکر اوپر ہم کر چکے ہیں۔ کاروباری ضرورتوں کے لئے اسلام نے یہ حل تجویز کیا ہے کہ 'اصل' یعنی سرمایہ کا مالک کاروبار میں شریک ہو جائے، اور نفع و نقصان دونوں کا حصہ دار بنے۔ شرح کا تعین اسلام نے بالکل آزاد چھوڑ دیا ہے۔ اس کا تعین کام کرنے والے اور 'اصل' دار (یعنی سرمایہ کا مالک) دونوں کی باہمی مفاہمت سے ہو گا۔

سرمایہ داری نظام میں سرمایہ کی فراہمی تو خوب ہوتی ہے، مگر 'اصل' (سرمایہ) کی شرح معاوضہ کا تعین کر کے 'اصل دار' اور کاروبار کرنے والوں کے درمیان ایک مستقل منافرت پیدا کر دی گئی ہے۔ اسلام نے اس لعنت (یعنی شرح معاوضہ کا تعین، جس کا دوسرا نام 'سود' ہے) کو ختم کر کے اس کا ایک نہایت اچھا حل پیش کیا ہے۔ اس نے 'اصل دار' اور کام کرنے والے دونوں کو ایک صف میں لا کھڑا کر دیا ہے اور دونوں کے مفاد ایک دوسری سے وابستہ کر دئے ہیں۔ ایک شخص کے پاس 'اصل' (سرمایہ) ہے، لیکن تجربہ نہیں؛ دوسری کے پاس تجربہ اور کارکردگی کی صلاحیت ہے، مگر 'اصل' نہیں؛ اسلام نے ان دونوں کو ملا دیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے تعاون سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اسلام نے ایسی تمام جائز تجارتوں کی اجازت دی ہے، جن میں 'اصل دار' صرف اپنا 'اصل' لگا دیتے ہیں اور کاروبار میں حصہ نہیں لیتے، بلکہ نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ البتہ منافع کی شرح کا تعین دونوں کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک کاروباری ضرورتوں کا تعلق ہے، اسلام نے فراہمی اصل (سرمایہ) کی پوری گنجائش رکھی ہے۔ اشتراکی نظام میں 'سود' تو اڑا دیا گیا[1]، مگر فراہمی 'اصل' کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا[2]۔

اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام نے آزاد مشترک تجارت کی پوری پوری اجازت دی ہے۔ اس نے صرف 'سود' کو حرام قرار دیا ہے، جو ناجائز استحصال کی جڑ اور تمام معاشی خرابیوں کی بنیادی علت ہے۔ سود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے، اُسے کاروبار کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، بلکہ وہ سود کی مقررہ رقم حاصل کر کے مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف 'مضاربت' میں 'اصل دار' کو کاروبار سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ نفع و نقصان میں شریک ہوتا ہے۔ سود میں رقم معین ہوتی ہے اور نقصان میں اصل دار شریک نہیں ہوتا۔ 'مضاربت' میں منافع معین نہیں ہوتا۔ اگر اسے یہ معلوم بھی ہو کہ اُسے منافع کا اتنا فی صد ملے گا، تب بھی اُسے نہیں معلوم کہ سال کے اختتام پر حساب کتاب کے بعد اس کے حصے میں کیا آئے گا؟ اوّلاً تو یہی متعین نہیں کہ تجارت میں نفع ہوگا یا نقصان؟ اور اگر نفع کا یقین بھی ہے تو وہ اپنے حصے کا تعین نہیں کر سکتا۔ اسی 'عدمِ تعین' کے باعث اصل دار کو کام نہ کرنے کے باوجود کاروبار سے پوری دلچسپی رہتی ہے۔

آج کل بہت سے مسلمانوں جیسا نام رکھنے والے حضرات بھی یہ کہنے لگے ہیں کہ تجارتی اور کاروباری سود پر وہ حکم عائد نہیں ہوتا، جو اسلام نے عام سودی کاروبار کے متعلق صادر کیا ہے۔ یہ اسلام کی روح سے یکسر ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

---

[1] گو اب سوویٹ روس میں ذاتی ملکیت کی حد تک 'سود' کی اجازت بھی مل گئی ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

[2] ملاحظہ ہو "اسلام اور سود" از ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔

اسلام نے سود کی ہر شکل کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کے تدریجی احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل درآمد سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ ان تدریجی احکام پر یہاں بھی ایک نظر ڈال لیں۔

اسلامی شریعت کے ہر طالب علم پر یہ حقیقت بخوبی واضح ہے کہ شارع حقیقی نے تمدنی اصلاح کے باب میں تدریج کو پیش نظر رکھا ہے۔ ابتدا میں تمام تر زور ایمان کو مستحکم کرنے اور عقیدہ توحید کے ذہن نشین کرنے پر صرف کیا گیا۔ اسی لئے مکی زندگی میں تمدنی اصلاح کے بنیادی اصولوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ ان کی عملی شکل مدنی زندگی میں ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ ہجرت کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی اور براہ راست قیادت میں اسلامی مملکت کی بنیادیں استوار ہونے لگیں، تو حالات کے پیش نظر اور موقع و محل کے لحاظ سے خاص خاص نفسیاتی حالتوں میں خاص خاص حکم نازل ہونے لگے۔ تا آنکہ اسلامی مملکت کے استحکام اور اقتدار کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تمدنی اصلاح کا کام بھی مکمل ہو گیا۔

تمدنی اصلاح (Social Reform) کے دوسرے شعبوں کی طرح سود کے ساتھ بھی یہی شکل اختیار کی گئی۔ یہ بات مکہ مکرمہ ہی میں واضح ہو گئی تھی کہ قرآن، معاشی معاملات سے سود کا عنصر قطعی طور پر خارج کرنا چاہتا ہے اور اس کی جگہ انسانوں کے معاشی تعلقات کو باہمی فیاضی اور فراخ دلی کی بنیادوں پر استوار کرنا اس کا نصب العین ہے۔ مکہ معظمہ میں سود کی حرمت کا کوئی اعلان نہیں کیا گیا بلکہ اس کے لئے زمین تیار کی جاتی رہی۔ انسان کی حقیقی ضرورتوں سے جو دولت بچ جائے اُسے جمع کرنے کی سخت مذمت کی گئی۔ نیز مسلمانوں کا یہ شعار بتایا گیا کہ اُن کی دولت میں غریب اور کم نصیب افراد کا بھی حق ہے:

وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (الذاریات) — اور ان کے مالوں میں حق ہے سوال کرنے والوں اور کم نصیب لوگوں کے لئے

اور ربا (سود) کے متعلق یہ قطعی اصول واضح کیا گیا کہ سود خواری سے بظاہر دولت میں جو بڑھوتری نظر آتی ہے وہ اللہ کے نزدیک بے قیمت ہے۔ اللہ کے ہاں تو اُن کی دولت بڑھتی ہے جو اللہ کی خوشنودی کی خاطر زکوٰۃ ادا کرتے ہیں:۔

وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ	اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ بعض لوگوں
النَّاسِ، فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ،	کے مال میں بڑھوتری ہو، تو اللہ کے
وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ	نزدیک تو اس سے مال نہیں بڑھتا۔
وَجْهَ اللَّهِ، فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ	البتہ مال ان کا بڑھتا ہے جو اللہ کی
(الروم - ۳۹)	خوشنودی کے لئے زکوٰۃ دیتے ہیں۔

اس کے بعد غزوۂ احد کے موقع پر سود کے متعلق پہلا قانونی حکم نازل ہوا، جو اس کے لئے بہترین نفسیاتی موقع تھا۔ مسلمانوں نے دیکھ لیا تھا کہ صرف مال کی محبت اور طمع زر کی بدولت انھیں جیتی ہوئی لڑائی ہارنا پڑی اور عظیم الشان نقصان اٹھانا پڑا۔ اس موقع پر طبیب حاذق نے بتایا کہ صرف مال کی محبت نے تمھیں کمزوری اور رسول کی نافرمانی پر آمادہ کیا، اور اس محبت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تم ایک مدت سے سود خواری کے عادی ہو، جس نے تمھارے دل و دماغ میں مال کی محبت پیوست کر دی ہے۔ اس لئے اس کا علاج یہ ہے کہ کم سے کم "سود در سود" تو ابھی سے چھوڑ دو۔ آل عمران میں غزوۂ احد پر تبصرے کے سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا	(ترجمہ) اے ایمان والو! سود در سود کھانا چھوڑ دو،
أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ	اور اللہ سے ڈرو۔ امید ہے کہ فلاح پاؤ گے
تُفْلِحُونَ - وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ	اور اس آگ سے بچو، جو کافروں کے لئے
لِلْكَافِرِينَ - (آل عمران - ۱۳۱-۱۳۰)	مہیا کی گئی ہے۔

اس حکم سے قانونی ممانعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور سب سے پہلے شرح سود پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ عرب میں سود در سود کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک یہ کہ جب کوئی شخص ایک خاص شرح سود پر کسی سے قرض لیتا اور مدت مقررہ پوری ہونے تک اُسے نہ ادا کرتا تو اس کو مزید مہلت دینے کے لئے شرح سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔[1] دوسری یہ کہ ایک مدت تک جب سود ادا نہ ہوتا تو وصول طلب سود کو اصل میں شامل کر کے پھر سود لگا دیا جاتا۔

اس موقع پر صرف اسی نوعیت کے معاملات کو حرام کیا گیا۔

اس حکم کے ساتھ وہ تہدیدی فقرہ بھی ہے، جسے سُن کر مسلمانوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے مسلمان؛ اور اس آگ میں ڈالا جائے، جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہو (اَلنَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ) اس سے زیادہ خوفناک بات ایک مسلمان کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟

یہ حکم ۳ھ میں نازل ہوا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلہ اور اجناس کے کاروبار میں سٹہ کو روکا اور ایک ہی جنس کی چیزوں کے مبادلے میں کمی بیشی کو سود قرار دیا۔ پھر سونے چاندی کے مبادلے میں ناجائز نفع بازی کا دروازہ بند کر دیا۔[2] اس کے ساتھ ساتھ سود کھانا یہود کا فعل بتایا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ اس جرم کی وجہ سے اُن سے ہم نے اپنی بہت سی رعایتیں چھین لیں۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا	تو یہود کے اس ظلم کی وجہ سے ہم نے
حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ طَیِّبٰتٍ اُحِلَّتْ	ان پر بہت سی پاکیزہ چیزیں حرام کر دیں
لَھُمْ وَبِصَدِّھِمْ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ	جو اُن کے لئے حلال کی گئی تھیں، اور اس لئے

[1] المسوی شرح الموطا۔ ج ۲۔ ص ۸۴۔ [2] ان احکام کی تفصیل کے لئے؛ ملاحظہ ہو، احکام القرآن (جصاص) ج ۱۔ ص ۵۵۶۔ ۵۵۱۔

كَثِيرًا وَأَخْذِهِمُ الرِّبَوٰا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا۔ (النساء: ۱۶۱-۱۶۰)

کہ وہ اللہ کی راہ سے روکنے لگے تھے اور سود کھانے لگے تھے، حالانکہ انھیں اس سے منع کیا گیا تھا۔ اور ناجائز طریقے پر لوگوں کا مال کھانے کی وجہ سے اور ہم نے اُن کے لئے دردناک عذاب مہیا کیا ہے۔

اس کے بعد اور فیصلہ کن ضرب فتح مکہ کے بعد لگائی گئی، جب کہ پورے عرب پر اسلام کی دھاک بیٹھ چکی تھی، اور اسلامی مملکت اتنی مستحکم ہو چکی تھی کہ اپنے احکام کو پورے عرب پر نافذ کر سکے۔ سود کے متعلق یہ آخری احکام سورہ بقرہ میں ہیں:۔

الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَوٰا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَوٰا ۗ وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوٰا ۚ فَمَن جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَانتَهَىٰ فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۔ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَوٰا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ

جو لوگ سود کھاتے ہیں، ان کا حال اس شخص کا سا ہے، جسے شیطان نے چھو کر باولا (مخبوط الحواس) کر دیا ہو۔ اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام[1]۔ تو جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لئے وہ سود خواری سے باز آجائے، تو جو کچھ

[1] یہاں 'سود' مطلق ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کا سود حرام قرار دیا ہے۔

كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (البقرة: ۲۷۵-۲۷۷)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ - فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ -

(البقرة: ۲۷۸-۲۷۹)

وہ پہلے کھا چکا، سو کھا چکا۔ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو اس حکم کے بعد اس حرکت کا اعادہ کرے وہ سب جہنمی ہیں، جہاں وہ سب ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کا مٹھا دیتا ہے اور صدقات کو نشوونما دیتا ہے۔[1] اللہ کسی ناشکرے بدعمل انسان کو پسند نہیں کرتا۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ تمھارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمھارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اور اگر اب بھی توبہ کر لو (اور سود سے باز آجاؤ) تو اصل لینے کے تم حق دار ہو۔ نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

سود سے متعلق اسلام کا یہ آخری حکم ہے۔ اس کے نزول کے بعد اسلامی مملکت کے دائرۂ نفوذ میں سودی کاروبار ایک فوجداری جرم بن گیا۔ چنانچہ سودی کاروبار کرنے والے

[1] ظاہر میں نگاہیں دیکھتی ہیں کہ سود سے دولت بڑھتی ہے اور صدقات سے گھٹتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ سود سے دولت چند افراد کے پاس سمٹ کر جمع ہو جاتی ہے اور خلقِ خدا دن پر دن تنگ حال ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برخلاف صدقات سے غریب سے غریب طبقوں میں دولت پھیلتی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچتی ہے۔ پھر سود کا نتیجہ بالآخر سوسائٹی کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، جس سے سرمایہ دار طبقہ بھی نہیں بچ سکتا۔ یہ تو دنیا کا حال ہے۔ آخرت میں تو صدقات کی نشوونما اور زیادہ نمایاں صورت میں ہوگی۔

قبیلوں کو دھمکی دی گئی کہ اس کاروبار کو نہ چھوڑو گے تو تمہارے خلاف فوجی کارروائی کی جائے گی۔

اسی طرح نجران کے عیسائیوں سے جب معاہدۂ صلح ہوا تو اس میں یہ تصریح کر دی گئی کہ اگر وہ سودی کاروبار کریں گے تو معاہدہ فسخ ہو جائے گا[1] اور حالتِ جنگ تصور کی جائے گی۔

اسی آخری حکم کی بناء پر حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے اہلِ علم سے منقول ہے کہ "دارالاسلام میں سود کھانے والے کو توبہ پر مجبور کیا جائے۔ اور نہ مانے، تو قتل کر دیا جائے[2]"۔

اس آخری حکم میں چند امور خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ ان پر غور کرنے سے اندازہ ہو گا کہ حکیم مطلق نے سود کی خرابیوں کو کتنی اہمیت دی ہے اور شریعت کا معاملہ اس کے باب میں کتنا سخت ہے:۔

(۱) ارشاد ہوا "وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ" (اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے) یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ وہ کھا چکا، اُسے معاف کر دیا جائے گا۔ تمام کبائر میں توبہ کے بعد معصیت دُھل جاتی ہے۔ مگر یہاں یہ شکل نہیں۔ یہ اجتماعی جرم ہے۔ اس لئے اس کا کفارہ بھی اجتماعی ہونا چاہیے۔ سود سے باز رہنے کے بعد قانونی طور پر تو اس سے ان رقموں کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا جو وہ پہلے بطور سود کے وصول کر چکا ہے، کہ اس سے انتظامی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن اخلاقی حیثیت سے اُس مال کی نجاست بدستور باقی رہے گی۔ اگر اس کے دل میں اللہ کا خوف ہے اور وہ ایک سچا مسلمان ہے، تو اسے خود کوشش اور تلاش سے مظلوموں کا مال واپس کرنا چاہیے۔ اور اگر اس کی دینی حس اتنی قوی نہیں، تو عجب نہیں، اللہ کی عدالت میں وہ بری ثابت نہ ہو۔ اسی لئے کہا گیا "وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ"۔

(۲) آخری آیت میں اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ کی دھمکی دی گئی ہے

---

[1] جصاص: ۱، ۵۶۱۔ [2] جصاص: ۱، ۵۵۹۔

(فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ) قرآن مجید میں کفر و شرک یعنی کھلم کھلا بغاوت کے علاوہ کسی بڑے سے بڑے گناہ کو بھی اللہ اور رسول سے جنگ کے ہم معنی نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات آئینہ ہوتی ہے کہ اسلامی قانون میں اس اجتماعی (Social) جرم کی کتنی اہمیت ہے اور قانون ساز حقیقی نے سوسائٹی کی بیماریوں کے لئے کتنا پائدار اور اکسیر نسخہ تجویز کیا ہے۔

(iii) بالکل آخر میں انسانی نظمِ معیشت کا اصل الاصول بتا دیا گیا ہے: "لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ" (نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے) اگر کوئی معاشرہ اس اصول پر قائم ہو جائے، تو پھر وہاں کوئی خرابی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔

اس آخری حکم کے بعد حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے فرمایا[1]:

وربا الجاھلیۃ موضوعٌ،	جاہلیت کے سود ساقط کئے جاتے ہیں۔
واوّل ربا اضعُ من ربانا ربا	اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس کا سود
عباس بن عبد المطلب	ساقط کرتا ہوں۔
فانہ موضوع کلہ،	

حدیثوں میں سود دینے والے، سود لینے والے، کاتب، گواہ — سب کے لئے سخت احکام آئے ہیں۔ افسوس کہ اس موقع پر اُن کی تفصیل نہیں دی جا سکتی (ملاحظہ ہو: صحیح بخاری، کتاب البیوع (باب الربا)

۲۔ مستقبل کے سودے | موجودہ معاشی نظام میں زرعی اجناس کے مستقبل کے سودے جائز قرار دئے گئے ہیں۔ مگر اکثر و بیشتر کاشتکاروں کے نمائندوں نے اُن کو مضر سمجھا ہے اور ان کے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح: باب قصۃ حجۃ الوداع۔

خلاف احتجاج کیا ہے۔ اسلام نے مستقبل کے تمام سَودوں کو سوسائٹی کے لئے سخت مضر قرار دیا ہے۔ اور صرف "حاضر" سودوں کی اجازت دی ہے۔ پچھلی لڑائی کے زمانے میں اسلامی نظریے کی خوبی تمام ماہرین معاشیات اور حکومتوں پر اچھی طرح واضح ہو چکی ہے۔ اور موجودہ حکومتیں بھی سٹہ بازی کو ممنوع قرار دینے لگی ہیں۔

۳۔ احتکار (ذخیرہ اندوزی) ذخیرہ اندوزی یا (Hoarding) کی لعنت اور اس کے بُرے اثرات اس پچھلی لڑائی کے زمانے میں اتنے الم نشرح ہو چکے ہیں کہ اُن کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بنگال کی ۱۹۴۳ء کی غذائی حالت اور جو تباہ کن قحط اس کے سبب سے ظاہر ہوا اور جس میں تقریباً ۳۵ لاکھ انسان لقمۂ اجل ہوئے، زیادہ تر اسی خود غرضانہ ذخیرہ سازی کا نتیجہ تھا۔ اس سلسلے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو احکام دیے، وہ موجودہ حکومتوں اور ماہرین معاشیات کے لئے سرمہ چشم بصیرت کا کام دے سکتے ہیں۔ صحیح مسلم کے الفاظ ہیں:

من احتکر فھو خاطئ [1] — جو احتکار کرے، وہ گنہگار ہے۔

دوسری حدیث میں یوں آیا ہے:

لا یحتکر الا خاطئ [1] — احتکار صرف گنہگار ہی کرتا ہے۔

امام نووی اور دوسرے فقہاء نے احتکار کا حکم صرف غذائی اشیاء کے لئے خاص کیا ہے لیکن حدیث کے الفاظ عام ہیں۔ اور حرمت کی علت دوا، کپڑا اور زندگی کی دوسری لازمی ضروریات میں بھی موجود ہے۔ اس لئے ہماری رائے میں احتکار کی حرمت کا حکم ان تمام اشیاء کے لئے ہونا چاہئے جو زندگی کی لازمی ضروریات میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

[1] صحیح مسلم، کتاب البیوع۔

۴۔ اکتناز | سرمایہ داری کی بے اعتدالیوں اور تباہ کاریوں سے سماج کو محفوظ رکھنے کے لئے اسلام نے اکتناز (دولت کے خزانوں کا محدود افراد کے پاس جمع ہو جانا: Accumulation of Wealth) کو ممنوع قرار دیا ہے اور ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بجائے زر و جواہر کے انبار لگائے جاتے ہیں، قرآن کریم میں سخت وعیدیں آئی ہیں:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ	(ترجمہ) اور جو لوگ سونا چاندی اپنے ذخیروں
وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا	میں ڈھیر کرتے رہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ	اُسے خرچ نہیں کرتے، تو ایسے لوگوں کو
اَلِيْمٍ، يَوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ	دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو
جَهَنَّمَ، فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ	(دردناک عذاب کا وہ دن) جب اسی
وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ، هٰذَا	سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی
مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ، فَذُوْقُوْا	جائے گی، اور پھر اُسی سے ان کے ماتھے،
مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔ (توبہ۔۳۴-۳۵)	اُن کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغ

دی جائیں گی۔ (اور اس وقت کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزا چکھو۔

یہ ہے زر و جواہر کے انبار کی قیمت اللہ کے نزدیک۔ قتل عمد اور سود کے علاوہ کسی جرم کے بارے میں ایسی سخت وعیدیں نہیں آئیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی مملکت ایسے مکتنزین (سرمایہ داروں) کے خلاف مناسب تعزیری کارروائی کرتی ہیں

---

[۱] مثال کے لئے ملاحظہ ہو: صحیح بخاری، کتاب البیوع (باب الربا)

حق بجانب ہوگی ـــــ یہ بھی یاد رہے کہ یہ سورۂ توبہ کی آیت ہے۔ گویا یہ آخری الٹی میٹم ہے۔

اس وعید کے ساتھ اگر اجارہ اور سودی رہن کی حرمت پر بھی نظر رہے، نیز جوئے اور سٹے کی ممانعت بھی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، تو پھر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح نمایاں ہو جاتی ہے کہ اسلام کے بنائے ہوئے اجتماعی نقشے میں سرمایہ داری کی دو بڑی برائیوں احتکار[1] (اشیائے ضرورت کو اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں گراں ہوں) اور اکتناز (معاشی وسائل کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا اجارہ قرار دینا) کی گنجائش نہیں۔ اسلام نے اس قسم کے تمام ناجائز وسائل معاش اور سوسائٹی کو تباہ کرنے والی اقتصادی خرابیوں کا ہمیشہ کے لئے قلع قمع کر دیا ہے۔ نیز اس نے جوا، زنا، رقص و سرود، رشوت، فریب دہی وغیرہ کو حرام قرار دے کر ان تمام فسادی عناصر کی راہ روک دی ہے، جو ایک ترقی یافتہ اور بڑھتی ہوئی سوسائٹی میں اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔

(ب) ایجابی قانونی ضابطے

(۱) زکوٰۃ

جس طرح سلبی ضابطوں میں سود کی حرمت کو اولیت حاصل ہے اسی طرح ایجابی ضابطوں میں زکوٰۃ کی اہمیت سب سے زیادہ ہے صرف زکوٰۃ کا نظام ایسا ہے، جو معاشرے کی اکثر معاشی مشکلات کا حل ہو سکتا ہے۔ قرآن و سنت میں معاشی اصلاح کے متعلق جتنے احکام دئیے گئے ہیں، اُن سب کا اصل الاصول یہ ہے کہ جائز اور فطری کسبِ مال (جو انسان کی مادی فلاح و بہبود کے لئے ناگزیر ہے) کی آزادی حاصل ہو اور اس میں نشو نما ہوتی رہے۔ مگر اس کے ساتھ سرمایہ کی گردش بھی برابر جاری رہے۔ سرمایہ چند افراد اور چند طبقوں میں محصور ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ ایسی راہیں نکالی جائیں

---

[1] راقم یہاں احتکار و اکتناز کو ذرا وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہے۔

جن سے سرمایہ کی گردش اور پھیلاؤ برابر جاری رہے۔ سرمائے کے سمٹاؤ کے خلاف کاری ضرب
سود کی حرمت نے لگائی اور سرمایہ کی گردش اور پھیلاؤ کی لازمی تحریک زکوٰۃ کی فرضیت سے
ہوئی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی فرضیت اور سود کی حرمت اسلام کی معاشی تنظیم کے
دو اہم رکن ہیں۔ زکوٰۃ کی فرضیت ظالمانہ سرمایہ داری اور منتقمانہ اشتراکیت دونوں کا راستہ
روک دیتی ہے۔ ان دو ارکان نے اسلام کے معاشی نظام کا اعتدال نمایاں اور ظالمانہ
سرمایہ داری اور جارحانہ اشتراکیت کے درمیان اُس کا اصلی عادلانہ مقام متعین کر دیا ہے۔
دنیا میں کوئی ایسا دینی یا معاشی نظام نہیں، جس نے غریبوں، ضعیفوں اور بے کاروں کی
پرورش اور نگہداشت کا اتنا معقول انتظام کیا ہو۔ یہ معمولی انکم ٹیکس نہیں۔ انکم ٹیکس تو صرف
ہر سال کی آمدنی ہی پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس زکوٰۃ اندوختہ پر بھی فرض ہے۔ یہ اکتناز
(دولت کے سمٹاؤ Accumulation of Wealth) کو روکتا ہے۔
اس کا مقصد یہ ہے کہ دولت چند افراد میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔ اس کے انتظام کی صورت
بھی شارع نے متعین کر دی ہے۔ یہ رقم جماعت کے مشترک خزانہ (بیت المال) میں جمع
ہوگی۔ اور خزانہ تمام لوگوں کی ضروریات کا کفیل ہوگا۔ بیت المال کی آمدنی کے ذرائع
اور بھی ہیں، جن کا بیان آگے آتا ہے۔ البتہ زکوٰۃ ان ذرائع میں سب سے زیادہ اہم ہے۔
زکوٰۃ کے سلسلے میں ایک بات رہی جاتی ہے۔ یہ شبہ نہ ہو کہ زکوٰۃ صرف زر اندوختہ
ہی پر فرض ہے۔ سونا چاندی کے علاوہ زرعی پیداوار، مویشی اور ہر قسم کے تجارتی مال پر بھی
سالانہ زکوٰۃ فرض ہے۔ تجارتی مالوں پر زکوٰۃ فرض کر کے سرمایہ داری کی خرابیوں کا پورا
پورا سدِ باب کر دیا گیا ہے۔ مختلف چیزوں میں زکوٰۃ کی مقدار مختلف ہے، جن کی تفصیل فقہ کی
کتابوں میں ملے گی۔ البتہ سونا چاندی میں خرید و فروخت کی صورت میں تجارتی مال کی حیثیت سے

ہو یا کنز کی صورت میں جمع ہو) چالیسواں حصہ زکوٰۃ دینا ہوگی۔ زکوٰۃ کی مقدار معین کرنے میں

ان عوامل کی بھی رعایت کی گئی ہے، جو اموالِ زکوٰۃ کے حصول اور پیداوار میں معاون ہوتے

ہیں۔ جن "اموال" میں مشقت کم پڑتی ہے، اُن میں زکوٰۃ کی مقدار زیادہ ہے اور جن میں زیادہ

مشقت کرنا ہوتی ہے، ان میں مقدار کم رکھی گئی ہے۔

۲۔ بیت المال | ہم بیت المال کو قانونی ضابطوں میں زکوٰۃ کی مناسبت سے شامل کر رہے

ہیں۔ ورنہ یہ اسلام کے معاشی نظام کا رکن اعظم ہے اور اپنی جگہ پر ایک مستقل ادارہ

(Institution) ہے، جو قوم کے تمام افراد کی واجبی ضروریات کا کفیل ہے

یہ پوری سوسائٹی کے لئے انشورنس کا بہترین انتظام ہے۔ اس سے ان تمام خرابیوں کا

سدباب ہو جاتا ہے، جو کسی جماعت میں امداد و اعانت کا مشترک نظم نہ ہونے کے باعث

پیدا ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں۔ اس ادارے کی موجودگی میں غریب مزدور کارخانہ دار کی

ناواجب شرطوں پر کام کرنے کے لئے مجبور نہیں ہوگا۔

بیت المال کا نظم ہوتے ہوئے نہ بیمہ کمپنیوں اور ان کی پالیسیوں کی ضرورت ہوگی

اور نہ بنکوں[1] میں روپے جمع کرنے کی اور نہ سودی کاروبار میں روپیہ لگانے کی۔ انسان ان

"احتیاطی تدبیروں" کی طرف تو صرف اس لئے مائل ہوتا ہے کہ بیماری، اور بڑھاپے کے لئے

کوئی معاشی سہارا پیدا کرلے، یا وہ پھر اپنی موت کے بعد چھوٹے بچوں، بچیوں کی خبرگیری

اور کفالت کے لئے بیمہ کمپنیوں اور سودی بنکوں کا رُخ کرتا ہے۔ لیکن جب مُلکی خزانہ

اس کی اور اس کے بچوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہوگا، جب مملکت اس کی ضعیفی اور بیماری

[1] اسلامی نظام میں بنک کاری سود کے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ جب سوسائٹی اسلامی نظم و آئین کو قبول کرلے

تو یہ کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس بحث کی تفصیل کو "اسلام اور سود" (ص ۲۱۷ - ۲۱۳) ملاحظہ کیجئے۔

کا مداوی کرنے کے لئے تیار ہوگی، یتیم بچّوں کی کفالت اور اُن کی تعلیم کا نظم سرکاری خزانے سے ہونے لگے گا، تو پھر ایک سلیم الفطرت انسان کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف ناروا اور غیر منصفانہ معاشی اداروں کی طرف رُخ کرنے کی ضرورت ہی کیا لاحق ہوگی؟

بیت المال اسلامی معاشی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس کا مغز زکوٰۃ کی فرضیت ہے۔ لیکن اسے دوسرے ذرائع سے بھی غذا ملتی ہے۔ اس سلسلے میں اُن ذرائع آمدنی کی طرف اشارہ کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

(۱) خراج :- یہ زرعی زمینوں پر عائد ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پہلے پہل عراق کی زمینوں پر خراج عائد کیا۔ دوسرے صحابہؓ ان زمینوں کو بھی فاتحین میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے سورہ حشر کی آیتوں سے استدلال کیا اور اپنی رائے پہ جمے رہے۔ اگر وہ زمینیں اُس وقت لشکر والوں میں بانٹ دی جاتیں، تو ایک قسم کا جاگیرداری نظام چل پڑتا۔ حضرت عمرؓ نے زمینیں اصل مالکوں کے قبضے میں رہنے دیں۔ اور ان پر مملکت کی طرف سے مناسب ٹیکس عائد کیا۔ اس طرح پر بیت المال کے ذرائع آمدنی میں ایک اہم باب کا اضافہ ہوگیا اور منشائے خداوندی

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔ تاکہ تم میں سے دولت مندوں کے درمیان دولت محصور ہو کر نہ رہ جائے۔[۱]

بھی پورا ہوگیا۔ امام ابو یوسفؒ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا یہ اقدام اللہ کی طرف سے ایک توفیقِ خیر تھی، جس سے تمام مسلمانوں کی بھلائی اور بہبود کا نظم ہوگیا۔ ورنہ بڑے فتنوں اور خطروں کا سامنا ہوتا اور مالی کمزوری کی وجہ سے اسلامی مملکت دفاع پر قادر نہ ہوتی۔[۲]

۱؎ الحشر - ۷؛ اس مسئلہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: امام ابوبکر جصاص کی احکام القرآن (۳: ۵۳۲-۵۳۸)

۲؎ کتاب الخراج بحوالہ السیاسۃ الشرعیہ، ص: ۱۰۶-۱۰۷؛

(ii) جزیہ :۔ یہ ذمیوں سے وصول کیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے زکوٰۃ مسلمانوں سے لی جاتی ہے۔ حقوق شہریت سے غیر مسلم ذمی بھی متمتع ہوتا ہے اور مملکت اس کے جان و مال کی محافظ اور ذمہ دار ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک مناسب ٹیکس ذمیوں سے وصول کیا جاتا ہے۔

(iii) عشور :۔ تجارتی مالوں کی درآمد اور برآمد پر پہلی اسلامی حکومتیں ٹیکس عائد کرتی رہی ہیں۔ اب بھی یہ ٹیکس عائد ہو سکتا ہے۔

(iv) مالِ غنیمت کا خمس :۔ مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہوتا ہے۔ باقی چار حصے لڑنے والوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں۔ بعض ائمہ کے نزدیک یہی حکم "فے" کا بھی ہے۔

(v) رکاز :۔ زمین کے دفینوں پر بھی بیت المال کا حق ہے، خواہ وہ قدرتی کانوں کی شکل میں ہوں، یا خزانوں کی صورت میں۔ دونوں صورتوں میں پانچواں حصہ بیت المال کا حق ہوگا۔ باقی خزانہ پانے والے کا۔

(vi) لاوارث کا ترکہ :۔ اس کی دو شکلیں ہیں : ایک تو یہ کہ میت کا وارث ہو ہی نہیں دوسری صورت یہ ہے کہ صرف میاں بیوی میں سے کوئی ایک وارث ہو۔ پہلی صورت میں بیت المال کُل ترکہ کا مالک ہوگا۔ دوسری شکل میں میاں یا بیوی کا ترکہ ادا کرنے کے بعد باقی مال بیت المال کی ملکیت ہوگی۔

(vii) لقطہ :۔ یعنی ایسے مال، بلکہ ایسی امانتیں بھی جن کے مالک کا پتہ نہ چل سکے، لقطہ کے حکم میں داخل ہیں۔ بیت المال کی ملکیت اس قسم کا مال بھی ہوگا۔

بیت المال کی آمدنی اور اس کے ذرائع حصول سے متعلق یہ سرسری اشارات تھے

موقع تفصیل کا نہیں۔ مقصود صرف یہ عرض کرنا تھا کہ اسلام نے بیت المال کے منظم اور مستحکم ادارہ (Institution) کے ذریعہ اپنی رعایا کی تمام لازمی ضرورتوں کی پوری پوری ذمہ داری قبول کر لی ہے۔ اور اسلام کے معاشی نظم میں کسی کو روٹی کے ایک ٹکڑے یا کپڑے کے ایک جوڑے کے لئے دربدر ٹھوکریں کھانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۳۔ تقسیمِ غنیمت | زکوٰۃ کے علاوہ اور جن ایجابی ضابطوں کے ذریعہ اسلام نے دولت کے پھیلاؤ کی کوشش کی ہے، اُن میں مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ بھی ہے۔ اجتماعی دولت کو زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم کرنے اور عام غربت و افلاس کو دُور کرنے میں زکوٰۃ کے علاوہ اس سے بھی بہت مدد ملتی ہے۔

غنیمت وہ مال ہے جو کفار محاربین سے دورانِ جنگ میں حاصل کیا جائے[1]۔ ان میں پانچواں حصہ بیت المال کا ہے۔ باقی چار حصے غنیمت حاصل کرنے والے لشکریوں پر انصاف کے ساتھ بانٹ دیے جائیں گے۔ پانچواں حصہ تو خیر غریبوں کے لئے مخصوص ہی ہے، باقی چار حِصّوں کا بیشتر جز۔ بھی کم استطاعت اور معمولی اوسط درجے کے لوگوں ہی کو ملتا ہے، کہ عام لشکریوں میں ان ہی کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ نیز غنیمت کی اس تقسیم میں ایک معمولی سپاہی

---

[1] بعض ائمہ نے "فَے" کو بھی غنیمت ہی کے حکم میں شریک کیا ہے۔ بعضوں نے دونوں کے مفہوم اور حکم میں فرق کیا ہے۔ ہمیں اس تفصیل سے یہاں بحث نہیں۔ دولت کے پھیلاؤ اور سمٹاؤ میں دونوں معاون ہیں ہمیں اس موقع پر اسی سے بحث ہے۔ اسی لئے ہم نے "فَے" کا الگ ذکر نہیں کیا۔ بہر حال عام رائے یہی ہے کہ زکوٰۃ اور غنیمت کے علاوہ بیت المال کو جو آمدنی ہو، وہ "فَے" ہے۔

تفصیل کے لئے ابن کثیر (جلد ۲ ص ۳۱۰) اور احکام القرآن (جلد ۳ تفسیر سورہ حشر) ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اور ایک کمانڈر کا حصہ یکساں رکھا گیا ہے اور خود خلیفہ اسلام کو بھی یہ حق نہیں کہ مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز چھانٹ کر اپنے لئے مخصوص کر لے۔ حضرت عمرؓ کی خدمت میں گورنروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں نے مالِ غنیمت کی بعض ناقابلِ تقسیم قیمتی چیزیں بازیابش کرنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے سختی کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کیا اور ان "ھدایا" کو عام سپاہیوں میں تقسیم کرا کر دم لیا۔

۴۔ قانونِ وراثت | سمٹی ہوئی دولت کے پھیلانے کی ایک تدبیر، اسلام نے قانونِ وراثت کے ذریعہ نکالی ہے۔ دنیا کے دوسرے قانونوں میں دولت کا وارث خاندان کا ایک فرد ہوتا ہے۔ آج بھی ہندوستان کے تعلقہ داروں اور بڑے زمینداروں کے ہاں عام طور پر بڑے بیٹے پورے تعلقے پر قابض رہتے ہیں۔ اس طرح پر یہ جاگیری نظام چلا آتا ہے لیکن اسلامی قانونِ وراثت کی موجودگی میں یہ صورت قائم نہیں رہ سکتی۔ ایک شخص جو بڑی تن دہی اور جانفشانی سے پیسہ پیسہ جمع کر کے دولت سمیٹتا ہے، اس کے مرتے ہی وہ دولت اُس کے وارثوں میں پھیلا دی جاتی ہے۔ بیٹے، بیٹیاں، باپ، ماں، بیوی، شوہر، بھائی، بہن سب ایک شخص کے وارث ہیں اور ایک ضابطہ کے مطابق سب پر میراث کا تقسیم ہونا ضروری ہے۔ قریب کے عزیز موجود نہ ہوں تو دُور اور پرے کے عزیز تلاش کئے جائیں گے، اور اگر کوئی دُور کا وارث بھی موجود نہ ہو تو اس کی سمیٹی ہوئی دولت بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، کہ اسلامی قانونِ وراثت کے نافذ ہوتے ہوئے بڑی سے بڑی زمینداری یا سرمایہ داری دو تین پشتوں سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ دولت اور امارت خاندان کے مختلف افراد میں بٹ جائے گی۔ اسلام کی خواہش یہی ہے، کہ دولت ہمیشہ گردش میں رہے، زیادہ سے زیادہ افراد میں پھیلے، اور منقسم ہو۔ فرمانِ ربانی (۵۹: ۷)

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (تاکہ تم میں سے دولت مندوں کے درمیان دولت محصور ہو کر نہ رہ جائے")

کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے۔ قانونِ وراثت اسلام کی اس خواہش کو اچھی طرح پورا کرتا ہے۔ اس کے نفاذ کے بعد دولت کا سمٹاؤ ہو ہی نہیں سکتا۔

یہاں تک تو اخلاقی اور قانونی ضابطوں کا ذکر تھا۔ اب آخر میں اسلامی نظام سے متعلق چند امور کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے، ان اشارات میں بعض پچھلی بحثوں کا اعادہ بھی ہو جائے۔ مگر ان پر خاص طور سے غور کرنا ضروری ہے، ورنہ اسلام کے معاشی نظام کی اصلی روح سے مانوس ہونا مشکل ہو گا۔

ایک اہم نکتہ اسلام کے معاشی نظام پر تنقید یا دوسرے معاشی نظاموں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے سے پہلے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اسلام ایک انفرادی معاملہ نہیں؛ نہ اس کی تعلیمات الگ الگ دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نقشہ ہے اور اسلام نے سماج کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے، اگر وہ ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو گا، جہاں انفرادیت و اجتماعیت کا ایک خوش گوار توازن کارفرما ہو گا۔ وہاں نہ جمہوریت کی طرح افراد خود غرض اور شتر بے مہار رہیں گے، اور نہ اشتراکیت اور فاسئیت یا نازیت کی طرح افراد کی کوئی مستقل حیثیت ہی نہیں ہو گی۔ اس الٰہی نظام میں ہر فرد بشر اپنے رب اور مالک کے سامنے اپنے اپنے اعمال کا الگ الگ جواب دہ ہے اور ہر ایک نظام بشری کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کر دینے پر مامور بھی ہے۔ یہاں فرد خود مختار و آزاد ضرور ہے، مگر یہ آزادی و خود مختاری جماعت اور معاشرے کی بھلائی کے لئے وقف رہتی ہے۔ انفرادیت و اجتماعیت کا ایسا دلپسند اور خوش گوار توازن اور میل کہیں دوسری جگہ نہیں نظر

آسکتا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ اسلام اضداد کا مجموعہ (Synthesis of opposites) ہے۔ انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کی بھلائیاں اس میں موجود ہیں۔ اشتراکیت اور آمریت دونوں کے اچھے عناصر اس کے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ مرکب (Synthesis) ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس کے کسی جزء کو دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہی غلطی ہے، جس کے شکار ہو کر دانش فروشانِ عصرِ حاضر" اسلام کا ڈانڈا کبھی اشتراکیت سے ملاتے ہیں، اور کبھی جمہوریت سے۔ کبھی ہٹلریت کا جامہ اس پر راست کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، کبھی اس کو حریت و معاشی مساوات کا علم بردار بتایا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سب باتیں صحیح بھی ہیں، اور غلط بھی۔ صحیح اس طور پر کہ ان سب نظامات بشری کے اچھے اور صالح عناصر اسلامی نظام کے اندر موجود ہیں۔ اور غلط اس لئے کہ اسلام نہ اشتراکیت ہے، نہ آمریت، یہ نہ یورپ کی جمہوریت ہے، نہ ایشیا کی شخصی حکومت ـــ یہ اپنا الگ نظام رکھتا ہے، اسے دنیا کے کسی نظام سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ دستور حکومت ہو یا معاشی نظام، اس کی راہ افراط و تفریط کے درمیان سے جاتی ہے۔

خلاصہ بحث خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے سوسائٹی کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے، اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے، تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہو گا، جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑ پتی ہوں گے نہ مفلس و محتاج طبقے؛ بلکہ ایک طرح کی درمیانی حالت ہو گی۔ ایسے افراد ضرور رہوں گے، جو اپنی انفرادی جد و جہد سے زیادہ دولت پیدا کر سکیں گے۔ لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا، اتنا ہی زیادہ خرچ کرنے پر مجبور ہو گا۔ گویا افراد کی کمائی سے صرف افراد کی مالی حالت نہیں اچھی ہو گی، بلکہ جماعت بہ حیثیت جماعت بھی خوش ہو گی۔ لائق اور محنتی افراد صرف اپنے لئے نہیں کمائیں گے۔ بلکہ پوری جماعت کے لئے۔ سرمایہ داری نظام کی طرح یہ نہیں ہو سکتا

کہ ایک کی زندگی دوسرے کے لئے موت اور ایک طبقے کی کمائی دوسرے کے لئے تباہی اور خانماں بربادی کا پیام بن جائے۔ زکوٰۃ کی فرضیت اور انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید سے دولت افراد میں بٹتی جائے گی۔ قانونِ وراثت سے دولت چند افراد میں محصور نہ رہ سکے گی۔ سود کی حرمت سے غریبوں کا خون چوسا نہ جاسکے گا اور پھر اجارہ اور احتکار کی حرمت کے ساتھ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ قیمت کی افزائش کے خیال سے سرمایہ دار غلہ کو روکے رکھیں اور غریب بسسک بسسک کر جان دے رہے ہوں۔ یہ باتیں اسلامی قانون کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہیں اور ہو سکتی ہیں، پر مصیبت یہ آن پڑی ہے کہ یہاں صرف مارکس (ف ۱۸۸۳ء) اینجلز (ف ۱۸۹۵ء) اور لینن (ف ۱۹۲۴ء) کے اقوال سند رکھتے ہیں۔ ابو حنیفہ (ف ۱۵۰ھ/۷۶۷ء) مالک (ف ۱۷۹ھ/۷۹۵ء) اور شافعی (ف ۲۰۴ھ/۸۲۰ء) کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہ گئی ہے۔ اور اگر کوئی ان کا حوالہ دے تو وہ غریب گردن زدنی!!

مختصر یہ کہ اسلام ایسا معاشی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جہاں شخصی ملکیت بالکل تباہ نہ ہو، اور سرمایہ داری بھی پیدا نہ ہوسکے۔ وہ معیشت میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کی خوبیاں جمع کرنا چاہتا ہے۔ وہ احتکار واکتناز کی حرمت کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ تمام افرادِ معیشت میں یکساں نہیں ہوسکتے۔ عدمِ یکسانی قدرتی ہے۔ صلاحیتوں کے اختلاف سے محنت ومعیشت کے ثمرات بھی مختلف ہوں گے۔ اس کے خلاف اشتراکیت شروع شروع انفرادی ملکیت کو یک لخت ختم کر دینا اور جبری نظام کے ذریعہ اپنے خیال میں دولت کی مساویانہ اور منصفانہ تقسیم کرنا چاہتی تھی اور وہ اب بھی ذرائع پیداوار کو یکسر حکومت کے قبضہ میں رکھ کر مزدوروں کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔ اشتراکی نظام میں افراد کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ نظام آمریت، خواہ فاسقیت کے رنگ میں ہو یا اشتراکیت کے روپ میں،

انسانی ترقی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ اسلام معیار معیشت کے تفاوت اور افراد کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے۔ اسلامی مملکت میں کاشتکاروں اور مزدوروں پر ناروا پابندیاں نہیں عائد کی جاتیں۔ "وہ مدارج معیشت کی مساوات قائم کرنا نہیں چاہتا، لیکن حق معیشت کی مساوات ضرور قائم کرتا ہے" یہ ضروری نہیں کہ سب یکساں مالدار ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کے لئے سامان معیشت کا انتظام ہو اور ہر ایک کو معاشی اور معاشرتی حیثیت سے ترقی کے مواقع حاصل رہیں۔

یہ اعتدال کی راہ ہے۔ یہی قانونِ فطرت ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں اسلام جو دینِ فطرت بھی ہے، اعتدال اور میانہ روی کی راہ اختیار کرتا ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ معیشت میں بھی اعتدال کی راہ نہ اختیار کرتا۔ جو لوگ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اختلافِ معیشت کو ختم کرنا چاہتے ہیں ۔ وہ قوانین فطرت کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہیں، اس لئے انھیں کبھی پائدار کامیابی نہیں حاصل ہو سکتی۔ موجودہ روس کی ناکامی اور اس کے نت نئے بدلتے ہوئے قانون اس پر گواہ ہیں۔

کتابیات

اشتراکیت سے متعلق جو کتابیں پہلے یا اس دوران میں مطالعہ کیں، اُن کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے آخر میں درج ہے۔ بعض کتابیں پہلے پڑھی تھیں۔ اس وقت پیش نظر نہیں، اس لئے ان کی طباعت یا نئے اڈیشن کے سنہ کا حوالہ نہیں دیا جا سکا۔ نیز ان میں سے تمام کتابیں شروع سے آخر تک نہ پڑھ سکا۔ وقت کی تنگی کے باعث چیدہ ابواب کے مطالعہ پر قناعت کرنا پڑی۔

اسلامی پہلو پر کوئی ایسی چیز نہیں پڑھی، جس سے اس کتاب کی تالیف میں خاص طور پر مدد ملی ہو۔ البتہ جو کتابیں اس موضوع پر یا اس سے متعلق معلومات پر ملتی رہیں، ان سے فائدہ اٹھاتا رہا ان کی فہرست بھی درج ذیل ہے۔ کتاب کی تحریر کے وقت قرآنی آیات کی تشریح میں ابن کثیر اور جصاص پر اعتماد کیا ہے۔ ترجموں کی زبان مولانا مودودی کی "تفہیم القرآن" سے مستعار لی ہے۔ فہم قرآن کے ساتھ دلّی کی ستھری زبان نے اُسے بہت دل آویز بنا دیا ہے۔ اس لئے اپنے ناقص فہم اور پوربی زبان پر ان کی ترجمانی کو ترجیح دی۔ البتہ کہیں کہیں آیتوں کے ترجمے میں تفہیم القرآن کی پابندی نہیں کی جا سکی ہے۔ جو کتابیں سرسری طور پر دیکھیں یا ان کا ایک آدھ حوالہ کہیں دیا گیا ہے وہ اس فہرست میں درج نہیں کی گئیں۔

(الف) عربی

(۱) تفسیر القرآن العظیم (ابن کثیر دمشقی؛ ف ۷۷۴ھ)

(۲) احکام القرآن (ابوبکر الجصاص الحنفی: ف ۳۷۰ھ)

(۳) سیاسۃ الشرعیہ (عبدالوہاب خلاف مصری)

(۴) الرسالۃ الخالدہ (عبدالرحمٰن عزام مصری)

(ب) اردو

(۱) تفہیم القرآن (مندرجہ رسالہ ترجمان القرآن) (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

(۲) ترجمان القرآن (مولانا ابوالکلام)

(۳) سود (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

(۴) اسلام کا نظریہ سیاسی ” ”

(۵) معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل ” ”

(۶) اسلام اور سود (طبع دوم) (ڈاکٹر انور اقبال قریشی)

(۷) ہیگل مارکس اور اسلامی نظام (مظہر الدین صدیقی)

(ج) انگریزی